معیار: علمی و تحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد:۱، شمارہ:۱، جنوری-جون ۲۰۰۹ء

تاریخ شاہ جہاں پور کے مآخذِ مطالعہ و تحقیق

ابو سلمان شاہجہانپوری*

شاہ جہاں پور صوبہ متحدہ کا ایک اہم ضلع اور اس کا شہر ہے۔ اس کا رقبہ ساڑھے چار ہزار مربع کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر اس ضلع کے نقشے پر شمال اور مشرق اور جنوب سے مغربی سمت میں نظر ڈالی جائے تو پیلی بھیت، کھیری، ہردوئی، فرخ آباد، بدایوں اور بریلی کے اضلاع کی سنہری زنجیر میں گھرا شمال مشرق سے جنوب مغرب میں ۱۲۰ کلومیٹر لمبا اور بالائی حصے میں کھیری اور پیلی بھیت کے بالمقابل ایک مقام پر صرف سولہ کلومیٹر اور ہردوئی اور بریلی کے بالمقابل ایک مقام پر ۶۲ کلومیٹر چوڑی ایک شاداب سرزمین نظر آئے گی، بس یہی شاہ جہاں پور ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکتا کہ کبھی یہ بھی ''میرا وطن'' تھا۔

شاہ جہاں پور کی طویل تاریخ ہے، جو بے شمار نشیب و فراز سے گزری ہے، لیکن اس نے قدیم دور سے آزادی کی منزل تک اور اس کے بعد گزرنے والے ساٹھ برسوں میں تاریخ کے ہر دور اور معرکۂ حیات کی ہر آزمایش میں کامیابی سے اس کا سر فخر سے بلند رہا ہے۔

اس کا پانی شیریں، آب و ہوا معتدل اور زمین زرخیز ہے۔ اس کے موسم قدرت کی تقسیم کے عین مطابق اور خوش گوار ہیں۔ اس کی ہواؤں میں خوش بوسی ہوئی ہے اور اس کی فضائیں محبت کے نغموں سے معمور ہیں۔ شاہ جہاں پور کی اپنی قابلِ فخر تاریخ ہے۔ اس کی اپنی تہذیب اور اپنا طرزِ تمدن ہے۔ اس میں بسنے والی اقوام کے اوصاف و خصایص میں، اخلاق و عادات میں، ذوق و مزاج میں بڑی یکسانیت اور یک رنگی ہے اور جہاں تضاد و تباین ہے اسے تحمل و مروّت نے ایک دوسرے کے لیے گوارا بنا دیا ہے۔ اس کے عوام کی زبان ہندی یا اُردو ہے۔ اس کی اپنی شان ہے، ان کے طرزِ بیان اور اسلوبِ تحریر میں ایک ندرت ہے، شاہ جہاں پور کی اُردو، اُردو ہو کر بھی نہ صرف لکھنؤ اور دہلی کی اُردو ہے بلکہ اپنے پڑوسی اضلاع سے بھی جدا لہجہ اور الگ انداز رکھتی ہے۔ شاہ جہاں پور بڑا مردم خیز شہر ہے۔ اس کی تاریخ کا ہر شعبۂ حیات اور دائرۂ علم و فن ناموروں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے امتیازات و خصوصیات بے شمار ہیں۔ شاہ جہاں پور میں وہ سب کچھ ہے جو وہاں کے ایک باشندے کی خوشی کا موجب ہو سکتا ہے۔

شاہجہاں پور پر مختلف نوعیت کی چھوٹی بڑی انیس تالیفات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، جو میرے علم میں اور بعض مطالعے میں آئیں۔ ان میں بے حد کتابیں ضمنی نوعیت کی بھی شامل ہیں۔ ان میں بیشتر تالیفات مخطوطات کی صورت میں تھیں لیکن اب شاید ان کا بھی وجود مٹ چکا ہے۔ صرف تاریخ میں ان کے نام اور خصوصیات کا تذکرہ ہی یادگار رہ گیا ہے۔

* سابق پروفیسر، شعبۂ اُردو، نیشنل کالج، کراچی؛ رہائش: آر-۱۰، ۵-سی/۳، نارتھ کراچی، کراچی

بہادر نامہ:

اس تالیف کا موضوع نواب بہادر خاں کے حالات ہیں اور جیسا کہ اس موضوع میں پھیلاؤ کی گنجایش ہے کہ اس میں ان کے خاندان کے افراد کے متعلق واقعات بھی درج ہوں گے، چناں چہ مطیع اللہ خاں نے بعض ارکان نواب بہادر خاں کے خاندان کا ذکر بھی کیا ہے لیکن اس تالیف کے مصنف کا نام ڈھونڈے نہیں ملا۔ اگر چہ میں نے مصنف کی تلاش میں کوتاہی نہیں کی پھر بھی اس کا امکان ہے کہ میری نظر ادراک سے قاصر رہی ہو! بہ ہر حال کتاب کے تعارف کے لیے اس کے چند اقتباسات کا نقل کرنا ضروری ہے۔ جناب مطیع اللہ خاں نے بہادر نامے کو نواب بہادر خاں کی اولاد و احفاد کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

نواب بہادر خاں کی ماموریِ قندھار اور وفات و وجہِ وفات کے بیان میں بہادر خانی انہار البحر و اخبار محبت و بہادر نامہ میں جو ان کی اولاد و احفاد کی تصنیف ہے کھلی ہوئی غلطیاں موجود ہیں۔ نواب مرتضیٰ خان نے بہادر خانی میں مہم قندھار ۱۰۵۸ھ و ۲۲ جلوس کا واقعہ وفات بہادر خاں ۱۹ جمادی الثانی سنہ مذکور کا سانحہ لکھا ہے اور ایسا ہی نواب احمد خاں کا بیان ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ [۱]

بہادر خان سے چھوٹے اور دلیر خاں سے بڑے ان کے ایک بھائی عنایت خاں تھے۔ ان کے اور ان کے بیٹوں کے بارے میں مطیع اللہ خاں مرحوم لکھتے ہیں:

> ''عنایت خاں کے پانچ بیٹے تھے، کام گار خاں، کام دار خاں، نیک نام خاں، معمور خاں، عظمت خاں۔ ان میں سے (اول الذکر تین) عہد نواب عزیز خاں میں شاہ جہاں پور چلے آئے تھے۔ (ان) تینوں بھائیوں سے نواب عزیز خاں نے اپنی بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔'' نیک نام خاں کے بیٹے جہاں خاں تھے، جن کو بگھا بی بی (ان کے چچا) کام گار خاں کی بیٹی منسوب تھیں، جو محلّہ بکسریاں کے چھوٹے قلعے میں، جو بگھا بی بی کا قلعہ بعد میں مشہور ہوا، رہتی تھیں۔ عظمت خاں بھی آخر میں شاہ جہاں پور میں آ بسے تھے۔ ان کی اولاد شاہ جہاں پور میں موجود ہے۔'' [۲]

بہادر نامہ کا حوالہ نواب مظفر خاں ابن نواب بہادر خاں کے تذکرے میں بھی آیا ہے۔ صاحبِ تاریخ مطیع لکھتے ہیں:

> ''شاہ جہاں نے بعد وفاتِ بہادر خان کے ان کو مختصر منصب پر بہ وجہ خورد سالی مقرر کیا تھا۔ عہد اورنگ زیب میں جوان ہو کر قابل بجا آوری خدمات ہوئے اور..... قلعہ پرینڈا کی جنگ میں کار ہائے نمایاں کیے..... ان کی زوجہ کا نام تاج بی بی تھا، جو نواب دلیر خان کی بیٹی تھیں۔ ان کے بطن سے ایک بیٹے شجاعت خان تھے جن کے نام سے موضع شجاعت پور قریب بادشاہ نگر آباد ہے۔ ان کے لاولد انتقال کرنے پر نسل کا خاتمہ ہو گیا۔ شجاعت خاں نے (موضع بادشاہ نگر کے پختہ باغ میں) باپ کا مقبرہ بنایا تھا، اسی میں ان کا بھی مزار ہے۔'' [۳]

عبداللہ خان ابن نواب تاج الدین خاں نواب بہادر خان کے پوتے نواب زین الدین خان ابن غیرت خان کے پوتے تھے بہ قول تاریخ مطیع:

> عبداللہ خان کی چار بیویاں تھیں، جن کے بطن سے پانچ بیٹے تھے۔ فیض اللہ خان، مستجاب خان، معین الدین

خان، سعداللہ خان، شہباز خان۔ بہادر نامہ میں ان کے پانچ بیٹے بیان کر کے، دو کا نام احمد خان و مصری خان لکھا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے باپ سے بغاوت کی تھی اور لڑائی میں قتل ہوئے تھے۔ مگر انہار البحر میں جو ستر برس پہلے کی تصنیف ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ الفضل للمتقدم!''

اس بیان سے معلوم ہوا کہ بہادر نامہ، انہار البحر کی تالیف (۱۲۵۵ھ) کے ستر برس بعد تقریباً ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں خوانین کے کسی صاحبِ ذوق نے مرتب کیا تھا۔

دلاور خان ابن نواب خان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال کابل میں ہوا تھا، لاش کو شاہ جہاں پور لا کر باپ کے مقبرے میں دفن کیا گیا تھا۔ تاریخ مطیع کا بیان یہ ہے:

''لاش ان کی کابل سے شاہ جہاں پور لا کر ان کے والد کے مقبرے میں دفن کی گئی۔'' [۴]

یہ بات مطیع اللہ خاں نے صرف ''بہادر نامہ'' کے حوالے سے لکھی ہے۔

بہادر خانی:

بہادر خانی کے مؤلف نواب مرتضیٰ خاں عرف جمعہ میاں نواب بہادر خان کے پڑپوتے نواب تاج الدین خان کے پڑپوتے اور نواب مصطفیٰ خاں عرف حاجی میاں کے برادر خرد تھے۔

تاریخ شاہ جہاں پور کے مؤلف خان بہادر مطیع اللہ خاں لکھتے ہیں:

''نواب مرتضیٰ خاں کے قلم کا کھینچا ہوا نقش بہادر خانی ۱۲۰۰ھ کا ہے۔ [اس میں] صرف یہ ڈھائی سطریں شاہ جہاں پور کے متعلق ہیں:

''دراواخر برائے وطن بہ حضور بادشاہ دیں پناہ عرضکردہ چند دیہات پرگنہ کانٹ را بنام خویش التمغا کنانیدہ شہرے را جنگل بریدہ۔ بہ سمت شرقی بریلی وتلہر آباد ساختہ بہ شاہ جہاں پور گردانیدہ۔''

باقی جو کچھ ہے، وہ بانی شاہ جہاں پور کے کارناموں کے بیان میں ہے۔ اور لطف یہ کہ مکمل نہیں۔'' [۵]

اسی تاریخ میں ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''نواب مرتضیٰ خاں (ابن فیض اللہ خاں) ذی علم وصاحب استعداد تھے۔ ۱۲۰۰ھ میں ''بہادر خانی'' تصنیف کی۔ مگر اختصار پسندی نے تاریخ شاہ جہاں پور کو تاریکی سے روشنی میں لانے کی اجازت نہ دی حال آں کہ اس وقت فرامین شاہی وخانگی تحریریں وضروری یادداشتیں ان کے پاس اور ان کے خاندان میں موجود تھیں اور وہ لوگ اب بھی زندہ تھے جن کے سینے خازن روایاتِ زبانی تھے اور مفصل تاریخ جمع کرنا نہایت آسان تھا۔

۲۱ ذی الحجہ ۱۲۲۷ھ (۱۶ دسمبر ۱۹۱۲، بہ روز ہفتہ) کو بادیہ پیمائے عدم ہوئے۔''

احمد خاں نے تاریخ کہی:

مرتضی خاں بود عموی بندہ بود نواب اعظم و اکرم
گفتم احمد چو سال تاریخش شد بجنت مقیم دریک دم

ان کی شادی نواب ذوالفقار علی خاں نبیرہ نواب محمد خاں بنگش کی بیٹی سے ہوئی تھی۔(انہار البحر) جن کے بطن سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے محمد خاں عرف جمعہ میاں تھے، جن کو ان کی پھوپھی زوجہ نواب اعزاز خان شاہ آبادی نے متبنیٰ کر کے تمام املاک کا مالک کر دیا تھا۔اس لیے شاہ آباد میں رہا کرتے تھے۔ [۶]

صاحب تاریخ صبیح نے بہادر خانی پر بہ ایں الفاظ تبصرہ کیا ہے:

''نواب مرتضیٰ خان: یہ نواب فیض اللہ خان ابن نواب عبداللہ خان کے بیٹے تھے۔ذی علم وصاحبِ استعداد تھے۔تاریخ دانی کا بہت شوق تھا۔۱۲۰۰ھ میں انھوں نے ''بہادر خانی'' لکھی مگر نہایت اختصار سے کام لیا۔اگر وضاحت سے لکھتے تو ایک مبسوط اور مفصل شاہ جہاں پور کی تاریخ ہوتی۔۲۱ر ذی الحجہ ۱۲۲۷ھ کو راہی ملک عدم ہوئے۔

نواب احمد خاں نے تاریخ کہی۔قطعہ:

مرتضی خاں بود عموی بندہ بود نواب اعظم و اکرم
گفتم احمد چو سال تاریخش شد بجنت مقیم دریک دم

ان کے بڑے بیٹے محمد خاں عرف جمعہ میاں تھے۔زوجہ نواب اعزاز خاں شاہ آبادی ان کی پھوپھی نے متبنیٰ کر کے اپنی کل جائیداد کا مالک بنا دیا تھا۔اسی باعث یہ شاہ آباد میں مستقل طور سے مقیم ہو گئے تھے۔'' [۷]

اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مولوی صبیح الدین نے حوالہ تو بہادر خانی کا ضرور دیا ہے لیکن مضمون ''تاریخ مطیع'' سے نقل کیا ہے۔

دلیر نامہ:

نواب عبداللہ خاں کی ایک تالیف کا ذکر جس کا سرِ عنوان نہیں۔تاریخ شاہ آباد موسوم بہ نامۂ مظفری کے مولف منشی محمد مظفر حسین خان سلیمانی نے کیا ہے۔دلیر نامہ اس کا نام موضوع کی مناسبت سے میں نے (راقم ایں سطور ا۔س۔ش) رکھ لیا ہے۔اس کتاب کا موضوع نواب دلیر خاں کی شجاعت بتایا گیا ہے۔صاحب نامۂ مظفری لکھتے ہیں:

''دلیر خان کی شجاعت کے متعلق نواب عبداللہ خان شاہ جہاں پوری نے ایک تاریخ لکھی ہے۔''

اس کے بعد دو جملوں میں کہا گیا ہے:

''اس میں تحریر کیا ہے کہ نواب دلیر خان بڑے تن وتوش کے جوان تھے۔زور وقوت میں یکتائے روزگار تھے۔''

یہ گویا کہ موضوع کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔اس کے بعد کے جملے سے اس کی تالیف کا زمانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:

''تاریخ انہار البحر کے حوالے سے (نواب عبداللہ خان) لکھتے ہیں۔''

اوراس سے آگے اس جملے کی تائید میں دکن کے معرکے میں ایک قلعے کی تسخیر میں قلعے کا دروازہ توڑ دینے کا واقعہ تحریر کیا ہے کہ کس طرح اسے توڑ کر فوج کے قلعے میں داخل ہو جانے کے لیے رکاوٹ دور کر دی تھی اور دیگر واقعات کے بیان سے نواب دلیر خان کی شجاعت اور طاقت پر استدلال کیا ہے۔ یہ متعدد واقعات مذکورہ تالیف سے نامہ مظفری کی جلد اول کے صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۸ پر بیان کیے گئے ہیں۔

انہار البحر چوں کہ نواب احمد خاں نے ۱۲۵۵ھ میں لکھی تھی۔ اب اگر صرف یہی اس تاریخ کا ماخذ ہو تب بھی اس کا زمانۂ تالیف ۱۲۵۵ھ کے بعد کا ثابت ہوتا ہے۔ ۸

اخبار محبت:

جو نواب محبت خان کی تصنیف ہے۔ وہ دراصل سلاطین تیموریہ کی تاریخوں کا اقتباس ہے۔ جس میں جستہ جستہ مختصر طور سے حالاتِ شاہ جہاں پور بھی کسی قدر بیان کیے ہیں، مگر ان میں غلطیوں کی آمیزش زیادہ ہے۔ ۹

مولوی صبیح الدین نے اپنی تاریخ میں اس کا نام ''محبت خانی'' لکھا ہے۔ ۱۰

انساب قبایل افغانی:

اس تالیف کو نواب محبت خان کی تالیف ''اخبار محبت'' کا تتمہ یا تصحیح و تفصیل سمجھنا چاہیے۔ اس کے موضوع اور خصوصیت کے بارے میں، اس کے مؤلف خان بہادر مطیع اللہ خان صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

> ''نواب محبت خان ان سب خیلوں کو افغانستان سے آ کر یہاں آباد ہوئیں۔ سٹر بنی نسل سے بتاتے ہیں، جو شجرۂ انساب کے خلاف ہے، مگر اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان میں اکثر سٹر بنی اور سٹر بنی میں سب سے زیادہ غوریا خیل تھے، جن کے قبایل کے ناموں سے دو ثلث کے قریب محلے منسوب ہیں اور ایک ثلث میں بیٹنی، غرغشتی، متّی اور وصلی ہیں۔ اگر اس کی تفصیل معلوم کرنے کا شوق ہو تو ہماری کتاب ''انساب قبایل افغانی'' پر نظر ڈالو۔'' ۱۱

چوں کہ یہ کتاب ''اخبارِ محبت'' کے شجرہ جات کی وضاحت یا تصحیح کے سلسلے میں ہے، اس لیے اس حوالے کا اندراج ''اخبارِ محبت'' کے بعد ہی مناسب معلوم ہوا۔ حال آں کہ اس کتاب کا زمانہ تالیف بیسویں صدی کی پہلی دو دھائیوں کا کوئی عرصہ ہے۔

تذکرۃ الاحباب (منظوم):

نواب محمد خاں متخلص بہ احمد نواب بہادر خاں کے پڑپوتے نواب تاج الدین خان کے پڑپوتے تھے اور نواب مصطفیٰ خاں عرف حاجی میاں (برادر خرد نواب مرتضیٰ خاں عرف جمعہ میاں) کے بڑے بیٹے تھے۔ شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ تذکرۃ الاحباب میں فرماتے ہیں:

وہ تھے شاہ اسحٰق جو دہلوی
وہ تھے میرے استاذ اور تھے ولی

نواب صاحب ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰ء) تک ضرور زندہ تھے۔ صاحبِ تاریخ مطیع نے ان کی آٹھ تالیفات نظم و نثر کا ذکر کیا ہے۔

''تذکرۃ الاحباب'' ان کی آخری تصنیف گمان کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''نواب صاحب کی تصانیف میں ''مناقب رزاقیہ'' جو ۱۲۳۰ھ میں لکھی گئی ہے، ابتدائی اور ''تذکرۃ الاحباب'' جو ۱۲۵۲ھ میں تالیف کیا ہے، سب سے آخری تصنیف معلوم ہوتی ہے۔''

تذکرۃ الاحباب کے بارے میں مولوی صبیح الدین فرماتے ہیں:

''ان کی کتابیں غدر میں تلف ہوگئیں۔ صرف ''تذکرۂ الاحباب'' رہ گئی، جس کا حوالہ اس کتاب (تاریخ صبیح) میں اکثر جگہ آیا ہے ان کا طرزِ تحریر بالکل نرالا اور سیدھا سادہ ہے، اگر یہ کتاب نہ مل جاتی تو بہت سے نام و اصحاب کا پتا نہ چلتا۔..... اپنے عزیز و احباب کا حال نظم میں لکھا ہے، ان کی خوبیوں کو سراہا ہے، ان کے مرنے پر ایک ایک کا ماتم کیا ہے اور ان کی تاریخ وفات کے قطعے لکھے ہیں۔'' ۱۲

انہارالبحر:

جو نواب احمد خاں نے ۱۲۵۵ھ میں لکھی ہے، یہ دراصل شجرہ نسب خاندان نواب دریا خان کا ہے، جن کی شاخوں میں دو چار پھول کمھلائے ہوئے تاریخ شاہ جہاں پور کے بھی دکھائی دیتے ہیں، جن میں نہ رنگ ہے نہ بو! اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اس میں اور اخبارِ محبت میں تباین و تضاد ہے:

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدۂ و دل عذاب ہیں دونوں ۱۳

نواب احمد خاں ابن حاجی میاں، نواب محمد خاں سے عمر میں چھوٹے مگر خوش خصالی و ملن ساری و ہر دل عزیزی میں ان کے ہم سر تھے۔ علمی مذاق بھی طبیعت میں موجود تھا۔ شاعر بھی تھے۔ انہارالبحر ان کی تصنیف ہے جو ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰-۴۱ء) میں لکھی ہے۔

اس کتاب میں تاریخی روایات کے بیان میں تو بہت سے تسامحات نظر پڑتے ہیں۔ مگر شجرۂ نسب خاندانی عہد نواب بہادر سے اپنے زمانے تک بے کم و کاست پوست کندہ لکھا ہے اور کسی جگہ ان کے صاف گو قلم کی زبان کو لغزش نہیں ہوئی ہے، جس سے ان کی راست بازی و جرأت کا اظہار ہوتا ہے، ان کی صاف گوئی نے اس کتاب کو چھپا ڈالنے پر ان لوگوں کو مایل کیا ہے جن کے نسبت کی اس میں پردہ دری کی گئی ہے۔ ۱۴

تاریخِ صبیح کے مؤلف کی نظر سے تو انہارالبحر ضروری گزری ہے لیکن اس کے بارے میں ان کی رائے وہی ہے جو صاحب تاریخ مطیع نے اپنی ظاہر کی تھی۔ ان کا بیان یہ ہے:

''انہارالبحر..... میں احباب شاہ جہاں پور اور اپنے خاندان کے حالات بے کم و کاست قلم بند کر دیے اور اپنے خاندانی حالات کو ذرہ برابر نہیں چھپایا۔ انتہائی اخلاقی جرأت و ہمت سے کام لے کر نسبت نامے صاف صاف تحریر کر دیے۔'' ۱۵

مولوی صبیح الدین میاں کا یہ بیان ان کے انہارالبحر کے مطالعے کا نتیجہ نہیں۔ ان کے سامنے تاریخ مطیع تھی۔ اسی کے مضمون کی انھوں نے تلخیص کر دی ہے اور حوالہ انہارالبحر کا دے کر ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے انہارالبحر تھی۔

لیکچر، تاریخ شاہ جہاں پور:

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خان نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''جو ایک وکیل ججی شاہ جہاں پور ساکن مراد آباد نے اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس منعقد شاہ جہاں پور ۱۸۹۵ھ میں پڑھا تھا۔ ماخذ اس کا خود لیکچرار کو معلوم نہ تھا۔ ایک شخص نے ان سے بیان کیا، وہ قلم بند کر کے اجلاس میں سنا دیا اور وقتی مقصد حاصل ہو گیا۔ تنقید و تمحیص قطعاً نہیں کی گئی۔ نہ اس کی ان کو ضرورت تھی۔ اس میں اکثر روایتیں بے اصل اور کذب بھی ہیں۔'' [۱۶]

رسم یہ پڑ گئی ہے کہ جہاں اس قسم کی انجمنوں کے جلسے ہوتے ہیں، عام طور پر استقبالیہ کی جانب سے اس شہر اور علاقے کی بعض خصوصیات بیان کی جاتی ہیں اور شہر کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ تحقیقات اور علمی مقالات پیش کرنے کا یہ مناسب موقع نہیں ہوتا۔ محمد اسماعیل ایڈوکیٹ مراد آبادی نے جو مضمون پڑھا یا لیکچر دیا، وہ اسی رسم کی ادائگی کے سلسلے میں ہے۔ اس میں واقعی کم زوریاں اور غلطیاں اور سنی سنائی باتیں تھیں۔ جن کی گرفت تاریخ شاہ آباد کے مصنف منشی محمد مظفر حسین خاں سلیمانی نے بھی کی اور مولوی مطیع اللہ خاں نے بھی لیکچرار کی خبر لی۔ لیکن اس لیکچر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ شاہ جہاں پور کی تاریخ میں پہلا مقالہ ہے یا اوّلین مقالات میں سے ایک ہے، چوں کہ وہ ۱۸۹۵ء میں لکھا تھا اس لیے اس قدامت میں کوئی شبہ ہی نہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا مذکورہ بالا اجلاس نواب محسن الملک مولوی مہدی علی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ سر سید احمد خان، ان کے بیٹے سید محمود، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، علامہ شبلی نعمانی، مسٹر بیگ (پرنسپل علی گڑھ کالج)، پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر تھیوڈر ماریسن، کالج کے ٹرسٹی اور دیگر عمایدین ہند اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔

گزٹیئر شاہ جہاں پور:

مولوی مطیع اللہ خان صاحب لکھتے ہیں:

جہاں تک انگریزی عہد سے اس کا تعلق ہے، مکمل و مفصل ہے۔ مگر قدیم تاریخ سے اس کی زنبیل بالکل خالی ہے۔ مؤلف نے قدیم تاریخ صرف چند صفحوں میں ختم کی ہے اور کٹھیریوں کے موافق نتایج نکالنے کے ارادے سے واقعات کو اس قدر توڑا مروڑا ہے کہ ان کی صورت بالکل مسخ ہو گئی ہے۔ [۱۷]

شاہ جہاں پور ضلع کے ایک گزٹیئر ایج آرنیول کا مرتبہ، مطبوعہ (۱۹۱۰ء) الٰہ آباد میرے سامنے ہے۔ معلوم نہیں صاحب تاریخ مطیع کے سامنے کون سی اشاعت تھی؟ لیکن کوئی بھی ہو جو حادثہ (۱۸۵۷ء) پیش آ چکا تھا۔ اس کے بارے میں گورنمنٹ کے نقطۂ نظر، معلومات، ان کے حوالہ جات اور ان کے مآخذ و مصادر اور ان سے استدلال میں تو ہرگز فرق نہ پڑا ہوگا۔ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہوگا، وہ برٹش اقتدار کے مصالح اور مفادات ہی میں ہوگا۔ براعظم ہند پاکستان کے باشندوں کے نقطۂ نظر سے اور ان کے مفاد میں تو ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ پھر بھی کسی نہ کسی پہلو سے اور کسی نہ کسی رائے میں سچائی معلوم ضرور کر لی جا سکتی ہے اور اصحاب فکر اور اہل نظر و تدبر سے حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی!

تاریخ شاہ جہاں پور:

صرف چند اوراق کا ایک رسالہ ہے، جو کسی اسکول ماسٹر نے دیہاتی اسکولوں میں پڑھانے کے لیے کسی وقت میں لکھا تھا۔ وہ ایک بے ربط افسانہ ہے۔ جس کو تاریخ کہنا، تاریخ کو شرمانا ہے:

برعکس نہند نام زنگی کافورا [۱۸]

جغرافیہ ضلع شاہ جہاں پور:

چوتھی جماعت میں سماجی مضامین کی ۳۲ صفحے کی ایک درسی کتاب ''جغرافیۂ ضلع شاہ جہاں پور'' کے نام سے برکت اللہ نامی ایک مدرس مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور کی لکھی ہوئی میرے سامنے ہے۔ اس میں ضلع کے محل وقوع، رقبہ، آبادی، قدرتی اور انتظامی تقسیم، تحصیلیں، پرگنے، ریل، سڑکیں، ندیاں، نالے، نہریں، زراعت، صنعت وحرفت، پیداوار وغیرہ وغیرہ کے بارے میں معلومات ہیں۔ اس میں ایک حصّہ تاریخ کا بھی ہے۔ جس میں ضلع کا صدر مقام اور مختلف قصبات ومقامات کی بناء تاریخ، آثار قدیمہ اور مختلف خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔

اس قسم کی درسی کتابیں ہر ضلع میں علاقائی وصوبائی اور ذریعۂ تعلیم کی زبانوں میں مثلاً یوپی میں انگریزی، ہندی، اُردو زبانوں میں مرتب کی جاتی ہیں۔ ان میں اضلاع کے بارے میں نہایت قیمتی اور صحیح معلومات ہوتی ہیں۔ ان کی زبان عام طور پر سہل بول چال کی اور ہر درجے کے طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتی ہے۔ ان کی تدریس لازمی ہوتی ہے۔ عام لوگوں کو ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، نہ ان سے دل چسپی ہوتی ہے۔ مؤرخین ان کی اہمیت سے ناآشنا نہیں ہوسکتے لیکن کتاب کے کتابی حیثیت میں ان کی نظر میں جچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ کتابیں نہایت ذمے داری سے مرتب کی جاتی ہیں اور ہر سال کلاس کی تبدیلی کے ساتھ صوبے اور ملک کی تاریخ اور جغرافیے کی تعلیمی سطح بھی بلند ہوجاتی ہے۔ جیسے چوتھی جماعت میں ضلع کی اور پانچویں جماعت میں صوبے کی تاریخ وجغرافیہ اور معاشرتی علوم کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ ابتدائی درجات کی کتابوں کی زبان عالمانہ اور انشا پردازانہ نہیں ہوتی۔ اس فن کی اعلا تصنیفات کی علمی وادبی خصوصیات ان ابتدائی درسی کتابوں میں ڈھونڈنا درست نہیں۔ ان کتابوں میں فنِ تاریخ اور علمی جغرافیہ نہیں پڑھایا جاتا۔ طلبہ کو معلومات سے واقف کرایا جاتا ہے اور ذوق پیدا کیا جاتا ہے۔

تاریخ احسانی:

مولوی محمد صبیح الدین میاں نے لکھا ہے کہ منشی احسان علی خاں احسان نے بھی شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھی تھی اور نہایت ضخیم تھی اور انھوں نے دیکھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو معلوم ہوا کہ منشی احسان علی خان مختار اور خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر مرحوم شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھ رہے ہیں..... (مگر)..... دونوں مؤلف یکے بعد دیگرے پیوندِ خاک ہوگئے۔ حسنِ اتفاق سے مجھ کو یہ دونوں کتابیں دیکھنے کو مل گئیں۔ میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار ضخیم جلدوں میں تھیں۔ مختار صاحب نے اپنی کتاب میں صحت روایات اور تاریخی واقعات میں انھوں نے اصولِ روایات ودرایت سے کوئی سروکار نہ رکھا'' [۱۹]

سخنوران شاہ جہاں پور کے مصنف مبارک شمیم نے اسے ''تاریخ احسانی'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ تین جلدوں میں تھی۔ اس کی پہلی اور تیسری جلد کا پتا نہیں چلا دوسری جلد انھوں نے دیکھی اور اس سے ''سخنوران شاہ جہاں پور'' کی تالیف میں فایدہ اٹھایا ہے وہ لکھتے ہیں:

''(منشی احسان علی خاں احسان نے) شاہ جہاں پور کی تاریخ بھی لکھی تھی، جو نا تمام رہ گئی۔ شاہ جہاں پور کی تاریخ کی ابتدا پیدایش حضرت آدم سے کی گئی تھی اور بہت تفصیل سے معلومات تحریر کی تھیں۔'' ۲۰

صاحبِ ''تاریخ صبیح'' نے اس کی نا تمامی کا ذکر نہیں کیا۔ اگر شاہ جہاں پور کی تاریخ میں یہ کتاب تین چار جلدوں میں ہونے کے بعد بھی نا تمام ہوتی تو یہ بات قابل ذکر ٹھہرتی۔ اور چوں کہ انھوں نے اسے دیکھا تھا اور بہ قول ان کے بالاستیعاب اسے پڑھا بھی تھا تو گویا کہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ تک کتاب کا مسودہ موجود محفوظ تھا۔ اس کے ضایع ہونے کا حادثہ بعد میں پیش آیا۔

احسان کا آبائی وطن بریلی تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ان کے والد منشی قاسم علی خاں کسی ابتلا میں مبتلا ہو کر گھر بار چھوڑ کر اپنے خاندان کو لے کر شاہ جہاں پور آ گئے تھے۔ احسان کی تعلیم شاہ جہاں پور میں ہوئی۔ کلکٹری میں مختار تھے۔ یہیں ان کی شادی ہوئی، اولاد ہوئی، یہیں پوری زندگی بسر ہوئی، یہیں وفات پائی اور یہیں سپرد خاک کر دیے گئے۔ شاعری کا شوق تھا۔ اساتذہ میں شمار ہوتا تھا اور تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ ان کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ مبارک شمیم صاحب نے لکھا ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دھائی میں (یعنی سنہ انیس سو میں ۲۱ تا ۳۰ کے دوران) ان کا انتقال ہوا۔

سرور ۱۳-۱۴ تاریخ صبیح و تاریخ مطیع: ان دونوں تالیفات کا تعارف بہ ایں سبب کہ دونوں کے تقابلی مطالعہ اور ان پر تنقید نے مضمون کی صنفی حیثیت اور تالیفی نوعیت کو قدرے بدل دیا ہے۔ اس تسلسل سے اسے الگ کر دیا ہے، لیکن ان کا سلسلہ نمبر ڈال دیا ہے تا کہ ترتیب میں ان کی جگہ کی نشان دہی ہو جائے۔

''شعرائے عجم و ہند'' اور ''سخن وران شاہ جہاں پور'':

اس سے پہلے کہ میں شعرا کے دو تذکروں کو تاریخ کتب کی حیثیت سے پیش کروں، یہ عرض کروں گا کہ جناب مولوی صبیح الدین میاں نے ہت پرشاد سرور کے تذکرے ''شعرائے عجم و ہند'' کو بہ ایں اظہار کہ ''اپنی'' تاریخ صبیح میں چند شعرائے شاہ جہاں پور کے تراجم نقل کیے ہیں اور ان کا نمونہ کلام درج کیا ہے، یا مولوی مطیع اللہ خان نے اپنی تاریخ میں ''انہار البحر'' کو جو نواب دریا خاں کے خاندان کا شجرۂ نسب ہے یا ''بہادر خانی'' کو بہ ایں اعتراف کہ اس میں شاہ جہاں پور کے لیے صرف ڈھائی سطریں ہیں، باقی جو کچھ ہے وہ بانی شاہ جہاں پور کے کارناموں کے بیان میں ہے، اسی طرح نواب مصطفیٰ خاں کی تالیف ''تذکرۃ الاحباب'' جس میں انھوں نے اپنے اعزہ و احباب کا حال نظم میں لکھا ہے اور صبیح و مطیع دونوں مؤرخوں نے اپنی تالیفات میں ان سے استفادہ کیا ہے اور کتبِ تواریخ میں ان کا شمار کیا ہے۔

میری رائے ہے کہ تذکروں، مثنویوں، سوانح عمریوں میں تاریخ کا بہترین مواد موجود ہوتا ہے، تاریخ کی کتابوں میں ان سے بیش بہا مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ ملکوں اور شہروں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ادب، شاعری، تہذیب، اصحابِ علوم و فنون کے تذکار ہوتے ہیں جن کے ذکر کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود یہ لٹریچر تاریخ اور اس کے مؤلفین مؤرخ قرار نہیں دیے جاتے۔ ان کے تراجم اور ان کی خدمات کے دایرے تاریخ کے حدود سے باہر، ان کی تالیفات کے فنون کے ضمن ہی میں شمار ہوں گے۔

میں نے مذکورہ شاہ جہاں پور کے دونوں مورخوں کے احترام میں شعرا کے تذکروں، اعزہ واحباب کے نوحہ و ماتم اور قطعات وفات اور شجرہ جات کے مجموعوں اور ان کے مؤلفین کو تاریخ اور مؤرخین ہی میں شمار کیا ہے اور انھیں کے اصول کے مطابق ''سخن وران شاہ جہاں پور'' اور اس کے مصنف مبارک شمیم مرحوم کو بھی تاریخ و مؤرخین میں شامل کیا ہے۔ لیکن میں یہ عرض کروں کہ سخنوران پر شمیم صاحب کا مقدمہ تاریخ کے زمرے میں ایک تاریخی شہ پارہ شمار ہوگا۔ لیکن میری رائے یہی ہے کہ اس قسم کی کتب کو تاریخی لٹریچر میں اور ان کے مؤلفین کو مورخین میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر اس بارے میں رعایت کی گئی تو ہر صاحبِ دیوان، مثنوی نگار اور شجرہ نویس اس کا متمنی ہوگا کہ اس کا ذکر مورخین میں اور اس کے کارنامہ فن کا بیان تاریخ میں کیا جائے! مجھے اعتراف ہے کہ ہت پرشاد سرور کا تذکرہ شعرائے عجم و ہند اگر اس کا کوئی وجود اب بھی ہے تو وہ لٹریچر کی بہت قیمتی متاع اور شاہ جہاں پور کے حوالے سے اس میں چند شاعروں کا ذکر بھی بہت اہم ہے، لیکن اس کے مقابلے میں اور تاریخ کے دایرے میں ''سخنورانِ شاہ جہاں پور'' کا مقدمہ اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے اور اس کا حق ہے اس کا اعتراف کیا جائے۔ آیئے اب سرور و شمیم کے تذکروں کا صبیح و مطیع کی روایت کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۔ شعرائے عجم و ہند:

یہ ہت پرشاد متخلص بہ سرورؔ نامی شاہ جہاں پور کا مرتبہ عجم و ہند کا فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ تاریخ صبیح کے مؤلف نے انھیں ایک کہنہ مشق، یگانۂ روزگار اور زبردست شاعر لکھا ہے۔ وہ اُردو اور فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے والد دیوان دولت رائے مبتہج (وفات ۱۲۱۵ھ) بھی اُردو اور فارسی کے خوش گو اور فصیح شاعر تھے اور دادا لالہ سکھ رائے مسرور (وفات ۱۱۷۴ھ) فارسی اور ہندی کے شاعر تھے۔ گویا کہ سرور خاندانی شاعر تھے اور ذوق شاعری ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مولوی صبیح الدین میاں کو ان کے مرتبہ تذکرہ شعرائے عجم و ہند کے کچھ اوراق دیکھنے اور اپنی تاریخ میں ان سے استفادے کا موقع ملا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''(سرور) علاوہ ایک زبردست شاعر ہونے کے صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے۔ شعرائے عجم و ہند فارسی میں ان کی بیش بہا تالیفات سے ایک بیش بہا یادگار ہے، جس میں شعرائے شاہ جہاں پور کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرور نے یہ ایک بڑا احسان اپنے شہر پر کیا۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو آج بہت سے نامور شعرائے شاہ جہاں پور کے حالات سے کوئی واقف نہ ہوتا۔ سرور نے شعرائے حال کا حال لکھا ہے، صاحب کمال احباب کے مرنے کا غم کیا ہے اور ان کی جدائی میں خون کے آنسوؤں سے روئے ہیں۔ ان کے نوحہ اور قطعات وفات موزوں کر کے یادگار چھوڑے ہیں۔'' [۲۱]

۲۔ سخن وران شاہ جہاں پور:

شاہ جہاں پور کے شاعروں کا یہ تذکرہ مبارک شمیم صاحب (مرحوم) کی کاوش علمی اور صدیوں تک یادگار رہنے والی تالیف ہے۔ وہ اس کا مواد جمع کرنے کے سلسلے میں برسوں شہر شہر پھرے ہیں تب کہیں یہ بیش بہا تذکرہ مرتب ہوا۔ اس میں ۲۲۸ شعرا کے تراجم ان کے نمونۂ کلام مع اس پر نقد و تبصرہ کے ہیں۔ یہ ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ لیکن اس پر جو مقدمہ مبارک شمیم مرحوم نے لکھا ہے وہ نہایت قیمتی تحریر ہے اور اس کا تعلق شاہ جہاں پور کی علمی، ادبی، تہذیبی تاریخ ہی سے نہیں، جیسا کہ ان کی تالیف کے نام اور اس کے موضوع سے ہوتا ہے، بلکہ ایک تاریخی شہر کی تاریخ بنا اس کے عروج، اس کی تہذیبی حیثیت، اس کے نامور بانی، اس کے خاندان اس کے اخلاف کے تذکرے۔ خوانین کے طرزِ حیات،

شاہ جہاں پور کی خصوصیات سے ہے اور اس میں بے شمار علمی و تاریخی معلومات ہیں۔ غرضے کہ یہ ایک نادر و یادگار تحریر ہے جو شاہ جہاں پور کی تہذیب اور تاریخ---- ہر دور اعتبار سے یاد رکھی جائے گی۔

تاریخِ شاہ جہاں پور، نامۂ اعجازی المعروف بہ تاریخ صبیح

آپ نے تاریخ شاہ جہاں پور کا پورا عنوان مطالعہ فرمایا۔ اس کے فاضل مؤلف کا نام اس طرح ہے ''عالی جناب مولوی محمد صبیح الدین میاں صاحب خلیل شاہ جہاں پوری (اسپیشل مجسٹریٹ)'' مؤلف نے اس کی تالیف کے لیے اپنے استاد مولوی حکیم محمد صاحب کو محرک قرار دیا ہے۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے بیڑا اٹھالیا تھا اور ادھر ادھر سے چند کتابیں حاصل کر کے مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا اور بعض ثقہ حضرات سے حالات کی تفتیش بھی شروع کر دی تھی۔ مگر مولانا موصوف کی ناگہانی وفات نے ان کی ہمت کو پست کر دیا اور اس وقت تک جو کچھ انھوں نے جمع کیا تھا، اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ پھر اسی زمانے میں جب انھیں معلوم ہوا کہ تاریخ شاہ جہاں پور کے موضوع ہی پر منشی احسان علی خاں احسانی اور خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر تاریخ لکھ رہے ہیں تو قطعاً اپنا ارادہ بدل دیا۔ مگر یکے بعد دیگر دونوں مؤلفوں کے انتقال نے ان کی آخری امید پر بھی پانی پھیر دیا۔ پھر اچانک ان کے ذہن میں ایک خیال آیا اور حسن اتفاق سے ان کو دونوں مذکورہ تاریخیں دیکھنے کو مل گئیں اور بہ قول آں موصوف کے:

''میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار جلدوں میں تھیں۔'' ۲۲

اس کے بعد انھوں نے نقاد کا قلم اٹھایا اور دونوں پر تنقید لکھ ڈالی۔ جہاں تک کہ آخر الذکر کے مؤلف کی کم نصیبی کا ماتم کر کے اور ان کے ورثا کو عدم توجہی کا مورد الزام قرار دے دیا۔ فرماتے ہیں:

''اور یہ کس درجے افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو تمام عمر کی محنت اور ایک بہترین یادگار ان کے ورثا کی عدم توجہی سے بلا طبع کے رہ گئی، شعر

حسرت پہ اس مسافر بے کس کے رویئے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے!

بہ ہر حال مذکورہ مورخ کی قسمت کچھ بھی ہو اور اس کے ورثا بہ جرم عدم توجہ کسی بھی سزا کے مستحق ٹھہریں مولوی محمد صبیح الدین کی قسمت جاگ اٹھی اور لکھتے ہیں:

''ان ہر دو قلمی نسخوں کے مطالعے سے یکا یک میرا پرانا شوق تازہ ہو گیا اور چوں کہ میرے پاس بھی سرمایہ ایک حد تک کافی تھا، میں نے خدا تعالیٰ پر بھروسا کر کے کام شروع کر دیا۔'' ۲۳

یہ موقع تھا کہ انھیں مولوی مطیع اللہ خاں صاحبِ تاریخ مطیع کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ ان کی تاریخ سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، لیکن شکریہ ادا کیا انھوں نے ایک ڈپٹی کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی قدر دانی اور ہمت افزائی کا۔

یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ تمدن و سیاست، تہذیب، سماجی حالات وغیرہ کے مضامین اور شاہ جہاں پور کے بانیوں اور ان کے خاندانوں کے تذکرہ و حالات میں ہے۔ دوسرا حصہ ہالیان ضلع و شہر کے مختلف طبقات کے بیان میں ہے۔ مثلاً علما و مشائخ، ادیب و شاعر، اطبا اور ڈاکٹر، قرا، اصحابِ فنون لطیفہ وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ آخر میں ایک تتمہ ہے جس میں بعض بیرونی مشاہیر جن میں علمائے دین، مشائخ، بادشاہ،

شہزادوں وغیرہ کے تذکار ہیں۔

کتاب کے شروع میں شاہ جہاں پور کے ایک معروف اہل قلم سید معین الدین کا مقدمہ ہے۔اس میں کتاب کی خصوصیات اور اس کے مؤلف کی شخصیت اور سیرت وخدمات کی بات کہی گئی ہے۔وہ حقیقت اور کتاب کے واقعی معیار سے بہت بلند ہے۔

مولوی صبیح الدین نے خود لکھا ہے کہ تاریخ شاہ جہاں پور لکھنے کی ترغیب انھیں ان کے استاد مولوی حافظ حکیم مرحوم نے دی تھی اور بار بار کے اصرار سے وہ اس پر آمادہ ہو گئے تھے اور نواب عبداللہ خاں مرحوم نے انھیں محبت خانی (اخبار محبت از نواب محبت خان) کی تلاش کر کے منگوا بھی دی تھی اور ان کے ایک محلے دار عباس علی خاں نے تذکرۃ الاحباب (از نواب محمد خاں متخلص بہ احمد) اور انہار البحر (از نواب احمد خاں) عنایت کر دی تھی۔ابتدا میں انھیں یہی کتابیں ہاتھ لگی تھیں۔ان تینوں کتابوں کی نوعیت یہ تھی:

۱۔ اخبارِ محبت کے بارے میں مؤرخ تاریخ مطیع لکھتے ہیں: وہ دراصل سلاطین تیموریہ کی تاریخوں کا اقتباس ہے جس میں جستہ جستہ حالات شاہ جہاں پور بھی کسی قدر بیان کیے ہیں۔مگر ان میں غلطیوں کی آمیزش زیادہ ہے۔

۲۔ تذکرۃ الاحباب کے بارے میں صبیح الدین خاں نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف نے اپنے عزیز واحباب کا حال نظم میں لکھا ہے، ان کی خوبیوں کو سراہا اور ان کی وفات پر ماتم کیا ہے۔

۳۔ انہار البحر کے بارے میں بھی مولوی صبیح الدین نے لکھا ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے احباب اور خاندان کے حالات تحریر کیے ہیں۔مولوی مطیع اللہ خاں نے لکھا ہے کہ ''یہ دراصل شجرۂ نسبِ خاندان نواب دریا خاں کا ہے'' اس کی مزید صفت یہ بیان کی ہے کہ اس میں اور اخبارِ محبت میں تباین وتضاد ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک کتاب تواریخ سلاطین تیموریہ کے اقتباسات کا مجموعہ ہے اور کہیں کوئی بات شاہ جہاں پور کی آبادی کے بارے میں آ گئی ہے۔دوسری کتاب نظم میں احباب واعزہ کا تذکرہ ہے اور تیسری دریا خاں کے خاندان کے بعض افراد کا تذکرہ اور شجرۂ نسب کی کتاب ہے۔ان تینوں کتابوں میں تاریخ شاہ جہاں پور کے لیے اس کے سال بنیاد ۱۶۳۹ء سے ''تاریخِ صبیح'' کے زمانۂ تکمیل، ۱۹۳۱ء تک کوئی مواد موجود نہیں تھا۔اور نمبر ۲ و ۳ میں بعض بیانات ومعلومات میں جو تضاد تھا اس کی کوئی بحث کہ ان میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے؟ مولوی صبیح الدین کی تاریخ میں موجود نہیں۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تینوں کتابیں ان کی دسترس میں تھیں۔انھوں نے پڑھا بھی ہوگا لیکن ان سے استفادے کا پتا نہیں چلتا۔نواب بہادر خاں اور نواب دلیر خاں کے اخلاف کی چند اور کتابوں کا پتا بھی چلتا ہے لیکن ان سے بھی استفادے اور ان کی معلومات سے کتاب کے مباحث کی زینت کا کوئی سراغ نہیں ملتا، لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں:

''ان کتب کے مل جانے سے مجھ کو ایک گونہ تقویت حاصل ہوئی۔''

اس کے بعد وہ تحقیق کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوئے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''اور میں نے ثقہ اور معمر حضرات سے گزشتہ حالات وواقعات کی جانچ شروع کر دی اور جن کتب ورسالہ جات میں یہاں کے حالات کا پتا چلا، ان کو منگا کر ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔''

تحقیق وتفتیش کے اس مرحلے میں انھوں نے کسی ایک ثقہ اور معمر شخص کا بھی نہ نام لیا اور نہ کسی کتاب ورسالے کی نشان دہی کی جس سے انھوں نے کوئی معلومات حاصل کی ہوں۔یہ ایسا مسئلہ تھا ہی نہیں کہ وہ معمر لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں اور معلوم کر آئے ہوں کہ صورتِ واقعہ کیا ہے اور نہ تاریخ شاہ جہاں پور، اس کے بانیانِ کرام کے بارے میں کتابیں اور رسالے کسی کتب فروش کی دکان پر

دستیاب تھے اور نہ کوئی لائبریری تھی جس میں یہ ذخیرہ موجود ہوتا۔ یہ بیان قطعاً لغو ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ بات یہ ہے کہ مولوی مطیع اللہ خاں اور منشی احسان علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے کام اور تاریخ شاہ جہاں پور کی تصنیف و تالیف کے مساعی و مشاغل کی جو شہرت ہوئی اور ان سے مولوی صبیح الدین میاں کو استفادے کے جو مواقع اتفاقاً حاصل ہو گئے تھے، اس کے بعد انھوں نے جو منصوبہ بنایا تھا اور جس میں سو فیصدی کامیاب بھی رہے تھے۔ اس کے لیے زمین ہموار یا فضا تیار کر رہے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مذکورہ الصدر جوسہ تصانیف کے حصول کے بعد بھی مایوس ہوئے تھے کہ ان میں تاریخ شاہ جہاں پور کے لیے کوئی مواد موجود نہیں تھا اور یہ محسوس کر کے انھوں نے ہمت ہار دی اور اس کے لیے بہانہ اپنے استاد کی موت کا تراشہ تھا۔

اوپر کے بیان کے تسلسل میں لکھتے ہیں:

''مگر مولانا (حافظ حکیم محمد صاحب) موصوف کی ناگہانی وفات سے میں کچھ ایسا شکستہ خاطر ہو گیا کہ ان مسودات کو الماری میں بند کر دیا۔''

یہاں تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے گریز کی راہ ڈھونڈ لی، فرماتے ہیں:

''اسی زمانے میں مجھ کو معلوم ہوا کہ منشی احسان خاں مختار اور خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر مرحوم شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھ رہے ہیں مجھ کو اطمینان ہو گیا اور میں نے قطعاً اپنا ارادہ بدل دیا!.

..... مگر یہ امید بھی پوری نہ ہوئی اور دونوں مؤلف یکے بعد دیگرے پیوند خاک ہو گئے۔'' ۲۴

مگر دیکھیے کہ قسمت کی یاوری نے کیا گل کھلایا کہ

''حسن اتفاق سے مجھ کو یہ دونوں کتابیں دیکھنے کو مل گئیں! میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار جلدوں میں تھیں۔''

مولوی صبیح الدین میاں کے لیے یہ ''حسن اتفاق'' ایسا ہی تھا جیسے بغیر تعمیہ و تخرجہ کے کسی نومولود باسعادت کی تاریخ ولادت نکل آئے۔ اپنی اسی تاریخ مطیع میں مولوی مطیع اللہ خاں کے ترجمے میں دیگر بے شمار محاسن کے اعتراف کے ساتھ مؤلف کی محنت و جاں کاہی اور اس کی تاریخ سے استفادے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا (مطیع اللہ خاں) مرحوم نماز روزے کے پابند، نہایت وضع دار، مستقل مزاج، دور اندیش اور مدبر تھے۔ شاہ جہاں پور کے دولت مند اور مقتدر اصحاب میں شمار تھا۔ تصنیف و تالیف کا شغل برابر رہتا تھا۔ شاہ جہاں پور کی تاریخ مطیع نہایت محنت اور جاں کاہی سے تالیف کی تھی۔ مگر وہ اس کو روزانہ کی کانٹ چھانٹ کی وجہ سے طبع نہ کرا سکے۔ میں نے (اپنی) اس کتاب (تاریخ مطیع) میں زیادہ حالات آپ کی تاریخ سے لیے ہیں۔''

اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ روزانہ کانٹ چھانٹ کے وہم سے وہ اس کو مکمل نہ کر سکے تھے۔ یہاں تکمیل سے انکار نہیں صرف کانٹ چھانٹ کی وجہ سے طبع نہ کرا سکنے کا بیان ہے لیکن میں قارئین کرام کی توجہ ان کے اس اعتراف کی طرف دلاؤں گا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں زیادہ حالات تاریخ مطیع سے لیے ہیں۔ اس بیان میں انھوں نے ''زیادہ حالات'' اخذ کر لینے کی کوئی حد مقرر نہیں کی! اور میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کچھ بھی ان کی تحقیق کا نتیجہ نہیں۔

خان بہادر مطیع اللہ خاں ایک صاحب فکر مؤرخ تھے انھوں نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھیں ہندوستان کی قدیم وجدید تاریخ پر عبور تھا۔ انھیں قدیم تاریخ نویسی کی خصوصیات اور جدید طرز تاریخ نویسی اور اس کے تقاضوں کا بہ خوبی علم تھا۔ ملازمت کے دوران مختلف اضلاع کی سیر و گردشِ حالات کے مشاہدے، عوام کی زندگی اور ان کے مسایل کے مطالعے اور تجربات نے ان کی فکر کو پختہ اور بصیرت کو فزوں کر دیا تھا۔ انھوں نے قدیم تاریخ نویسی پر جو تبصرہ کیا ہے اور جدید طرز تاریخ نویسی پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے ان کی بلند خیالی، تاریخ میں ان کی گہری نظر اور وقت کے تقاضوں اور تاریخ نویسی کی موجودہ ضرورتوں اور ان کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے اسی فلسفۂ تاریخ کے مطابق شاہ جہاں پور کی تاریخ کا خاکہ تیار کیا تھا اور پہلی جلد اگرچہ اپنے پہلے مسودے کی صورت میں ہمارے سامنے آ گئی ہے، لیکن اس کے مباحث کے پھیلاؤ، ان کی ترتیب اور ان کے مضامین دیکھ کر خان بہادر مرحوم کی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مطیع اللہ خاں نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

☆ اس کا پہلا حصہ انھی کے الفاظ میں ''بنیانِ شاہ جہاں پور'' ہے۔ اس میں شاہ جہاں پور اور ضلع شاہ جہاں پور کی قدیم و جدید تاریخ اور خاندانِ بانی شاہ جہاں پور کے حالات میں ہے۔ یہ رجسٹر سائز کے ۹۸۸ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

☆ دوسرا حصہ ''اعیانِ شاہ جہاں پور'' کے عنوان سے ارباب کمال اور خوانین کے تراجم پر مشتمل ہے اور

☆ تیسرا حصہ ان لوگوں کے تذکار میں ہے جو مختلف اقوام کے لوگ تھے۔ شاہ جہاں پور میں آباد ہوئے اور شاہ جہاں پور کی ترقی، علوم وفنون کی ترویج واشاعت ایک نئی تہذیب وطرزِ زندگی کو جنم دینے کا موجب اور شاہ جہاں پور کو زینت دینے اور اس کی شان و شوکت میں اضافے اور قدیم وجدید کا ایک حسین سنگم بنانے میں جن کا تہذیبی ذوق اور طرزِ زندگی کام آیا۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ شاہ جہاں پور نے الگ حیثیت میں، روہیل کھنڈ کا حصہ بن کر، اودھ میں شامل ہو کر اور کمپنی کے زیر انتظام آ کر تمام مختلف حالات میں اپنے امتیاز کو باقی رکھا۔ محترم جمیل احسن خان شاہ جہاں پوری حفیدِ رشید حضرت مولوی مطیع اللہ خاں، جن کے صرفِ ہمت نے پہلی جلد کو اہلِ نظر اور اصحابِ ذوق سے روشناس کرایا ہے، آں موصوف کا خیال ہے کہ اس کا بقیہ حصہ ایک ہزار صفحات کی ضخامت رکھتا ہے۔ اگر ان تینوں حصوں کے مواد کو جمع کر دیا جائے تو رجسٹر سایز کے پورے دو ہزار صفحات اور تاریخ صبیح کے مطبوعہ کے مطبوعہ صفحات وسایز میں پونے تین ہزار صفحات بنیں گے۔ جب مولوی صبیح کے تمام مضامین ومباحث دونوں حصوں کے پانچ سو صفحات میں سما گئے ہیں۔

ایسا کیوں کر ممکن ہوا؟ صرف اس لیے کہ مولوی صبیح الدین میاں نے اصل مآخذ تک رسائی حاصل نہیں کی، نہ ان کے پاس تاریخ شاہ جہاں پور کے لیے ضروری مواد تھا، نہ انھیں اس کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی، نہ ان میں تاریخ نویسی کی صلاحیت تھی، نہ شوق نے مہمیز لگائی، نہ ذوق نے رہنمائی کی۔ ان کے سامنے مولوی مطیع اللہ کی اعلا درجے کی جزئیات وکلیات پر حاوی مکمل ومستند تاریخ شاہ جہاں پور کی تین چار جلدیں اور منشی احسان علی خاں احسان کا کل سرمایۂ تاریخ موجود تھا۔ ان سے ضروری اور اپنے ذوق کے مطابق مواد اخذ کر لیا اور ''تاریخِ صبیح'' مکمل ہو گئی۔

منشی احسان علی کی تاریخ میں نے نہیں دیکھی، مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ میرے سامنے اور تاریخ صبیح سے اس کے بہت سے مضامین ومباحث کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں؛

۱۔ انھوں نے ان تمام مباحث سے صرف نظر کر لی جو تاریخ کے اہم مباحث ضرور تھے اور مولوی مطیع اللہ خاں نے ان میں اپنی جگہ کھپائی تھی لیکن مولوی صبیح الدین میاں کا ذوق ان سے آشنا نہ تھا اور نہ وہ انھیں تاریخ میں اہمیت ہی دیتے تھے۔ ان کے لیے

انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان مباحث کو جو پچاسوں نہیں سیکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، چھوڑ دیا جائے۔

۲۔ پچاسوں مقامات پر انھوں نے متن میں مرحوم مطیع اللہ خاں کا حوالہ دیا ہے کہ وہ یہ لکھتے ہیں اور حصہ اول میں تقریباً بیس مقام مختلف مضامین میں اور حصہ دوم میں ساٹھ سے زیادہ تراجم میں استفادے کا اعتراف کیا ہے۔

۳۔ پچاسوں مقامات پر مضمون کو بغیر حوالے کے نقل کر لیا ہے۔ حال آں کہ وہ مضمون زبان اور لفظوں کی یکسانیت اور جملوں کی ساخت اور ترتیب میں تاریخ مطیع میں موجود ہے۔

۴۔ اور یہ جو انھوں نے لکھا ہے کہ اخبارِ محبت، تذکرۃ الاحباب اور انہار البحر کے مل جانے سے انھیں ایک گونہ تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے ثقہ اور معمر لوگوں سے گزشتہ حالات وواقعات کی تلاش شروع کر دی اور جن کتب ورسالہ جات میں یہاں کے حالات کا پتا چلا ان کو منگا کر ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تھا تو اس کا کوئی ثبوت بھی ہونا چاہیے۔ لیکن اس قسم کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

الف: زبانی روایت کے صرف دو حوالے ہیں، وہ بھی کسی حوالے کی تائید میں! اس طرح ثقہ اور معمر حضرات سے استفادے کا تو مسئلہ یوں صاف ہو گیا۔

ب: مذکورہ بالا تینوں کتابوں کے تمام حوالے ٹھیک ٹھیک انھیں مسایل ومباحث میں ہیں جن میں مولوی مطیع اللہ خاں نے ان کا حوالہ دیا ہے۔

ج: ان کے علاوہ پوری تاریخ صبیح میں کسی نادر کتاب یا رسالے کا حوالہ کسی اہم بحث کے تصفیے یا کسی خاص بیان کی تائید وتوثیق یا کسی دعوے کے استدلال یا اثبات میں نظر سے نہیں گزرا۔

۵۔ متعدد مقامات پر طویل طویل عبارتوں کے بعد لکھا دیا ہے: ''تاریخ مطیع ملخصاً''، کسی علمی بحث میں کسی صاحب قلم کی تحقیق سے استفادے کا یہ انداز ہرگز پسندیدہ نہیں! ایسے تمام مواقع پر محقق کی کاوش کا پورا پورا اعتراف کرنا چاہیے تھا!

تاریخ شاہ جہاں پور موسومہ تاریخ مطیع:

مولوی مطیع اللہ خاں نے شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تھا، تو یہ فیصلہ انھوں نے بے سوچے سمجھے نہیں کیا تھا۔ نہ وہ کسی کی نقل کر رہے تھے، نہ انھیں اپنی نام وری اور شہرت مقصود تھی اور نہ انھیں کسی نے مصنف بننے کی ترغیب دی تھی۔ انھوں نے شاہ جہاں پور کی تاریخ کو وقت کی ایک ضرورت سمجھ کر تاریخ کا ایک خلا پر کرنے کے لیے قوم وملّت کی رہنمائی کے لیے، ذہن وفکر کی تربیت کی غرض سے، قوموں کی صف میں امتیاز پیدا کرنے اور اپنا صحیح مقام پانے کے لیے اور زندگی کی پستیوں سے نکالنے اور ایک کامیاب اور باعزت زندگی کے حصول کے لیے، مختصر یہ کہ ایک معرکۂ حیات فتح کرنے کے لیے، وہ شاہ جہاں پور کے ماضی کی سیر کرانی چاہتے تھے تاکہ فکر وبصیرت کی روشنی میں، تجربات کی پختہ بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔ ان کے ذہن میں تاریخ نویسی کا ایک اہم مقصد اور جامع خاکہ تھا۔ ان کی اس بات پر گہری نظر تھی کہ قدیم طرز تاریخ نویسی میں جو باتیں تاریخ کی اہم خصوصیات سمجھی جاتی تھیں اب وہ تاریخ میں جگہ پانے کی لایق نہیں سمجھی جاتیں اور جن باتوں کو تاریخ کی خصوصیات کے خلاف سمجھا جاتا تھا اب انھیں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مولوی مطیع اللہ خاں لکھتے ہیں کہ اب ان مضامین کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

''جن کو پرانے مؤرخ خشک و بدمزہ سمجھ کر ہاتھ تک نہیں لگاتے یعنی تعلیم و تمدن، اقتصادیات و زراعت، صنعت و حرفت، تجارت و رفاہِ عامہ، صحتِ عوام، ملک کا امن و خوش حالی، اخلاقی و دماغی ترقی، قوانین سلطنت و معدلت گستری وغیرہ کی مشرح کیفیت۔''

مؤلف تاریخ مطبع کے یہ نہایت بلند خیالات تھے۔ چناں چہ انھوں نے نہ صرف پٹھانوں کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا بلکہ شاہ جہاں پور کے شہر و قصبات سے دیہات تک اور نہ صرف سیاسی بلکہ علمی، تعلیمی، تہذیبی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی اور حکومت کے نظم و نسق کے دور دراز گوشوں تک پھیلی ہوئی تاریخ کا خاکہ تیار کیا، آخر میں انھوں نے اس تاریخ کے مقصد کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

''یہ کام صرف قوم و وطن کی محبت اور بزرگوں کے کارناموں کی حفاظت اور آیندہ نسل کی واقفیت کی امید سے کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اس کا اور کوئی مقصد نہیں۔''

اس کے بعد مؤلف نے کتاب کے نام اور اس کے مضامین کی تقسیم کی صراحت کی ہے۔ انھوں نے کتاب کے تمام مضامین کو تین عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس تذکرے کو فاضل مرتب ہی کے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ مؤلف مرحوم لکھتے ہیں:

نام اس کا ''تاریخ مطبع'' ہے، جس سے سال ختم تالیف ۱۳۴۰ء ہجری بلا تعمیہ و تخرجہ و نامِ مصنف بہ طور براعۃ الاستہلال ظاہر ہوتا ہے:

رباعی

از عنایاتِ خداوند رفیع — یافت اِتمام چوایں نقش بدیع
سال تالیف بجستم زخرد — کردا رشاد کہ ''تاریخ مطبع'' — ۱۳۴۰ھ

(۱۳۴۰ھ ہجری سال کے مطابق شمسی کلینڈر کا سال ۱۹۲۲ء ہوتا ہے۔)

مضامین کے لحاظ سے اس کے تین حصے ہیں؛

پہلے حصے کا نام: ''بنیانِ شاہ جہاں پور'' ہے۔ اس میں شاہ جہاں پور و ضلع شاہ جہاں پور، قدیم و جدید تاریخ اور خاندانِ شاہ جہاں پور کے حالات ہیں۔

دوسرے حصے کا نام: ''اعیانِ شاہ جہاں پور'' ہے۔ اس میں اربابِ کمال و خوانینِ شاہ جہاں پور کے تراجم ہیں اور

تیسرے حصے کا نام: ''واردانِ شاہ جہاں پور'' ہے اس میں ارباب فضایل و معززین واردین کے تذکرے ہیں۔

فاضل مؤلف نے اس پر ایک نہایت عالمانہ اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جو بہ ذاتہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ پر ایک بلند پایہ و محققانہ، نہایت فکر انگیز و مفید اور لایق مطالعہ مقالہ ہے۔ اس کے مطابق اُن کے اپنے فلسفہ و اصول تاریخ نویسی میں درجہ کامیابی کا فیصلہ تو اسی وقت کیا جا سکے گا جب کہ اس کی تینوں جلدیں سامنے ہوں۔ اب تک چوں کہ اس کا پہلا حصہ ہی شایع ہو سکا ہے اور وہی ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہے، بہت خوب ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔

خدا کرے اس کے بقیہ دونوں حصوں کی اشاعت کا سر و سامان ہو جائے!

مولوی صبیح الدین کی تنقید اور اس کا پس منظر:

صاحب تاریخ مطیع ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم کے آغاز سے لے کر کتبِ وسطیٰ تک کی تحصیل شاہ جہاں پور میں کر لی تھی۔ تکمیل کے لیے مدرسۂ عالیہ رام پور کا سفر اختیار کیا اور ایک مدت قیام کر کے تکمیل علوم کی۔ پرائیویٹ طور پر انگریزی سیکھی اور قابلیت پیدا کی۔ ۱۸۹۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کے منصب سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۰ء میں سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

مولوی مطیع اللہ خاں نہایت ذہین شخص تھے۔ مطالعے اور تصنیف و تالیف کا شوق تھا اور ایک عمدہ کتب خانہ اپنی زندگی میں جمع کر لیا تھا اور کئی تصانیف بھی یادگار چھوڑی تھیں۔ یہ کتب خانہ ربع صدی تک خان بہادر مرحوم کے اخلاف نے سنبھال کر رکھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد جب شاہ جہاں پور میں ''گاندھی فیض عام کالج'' کا قیام عمل میں آیا تو اس کے حوالے کر دیا۔ ۱۸/جون ۱۹۲۵ء کو جب کہ ان کی عمر تقریباً ۶۵ برس کی تھی، ان کا انتقال ہو گیا اور ان کا وطن مالوف اور مولد و منشائے طفولیت ہی ان کا مدفن قرار پایا۔ ان کی زندگی کا وہ دور جو ۱۸۹۳ء میں ان کی ملازمت سے شروع ہوا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً ۵ برس کے شب و روز پر محیط تھا، نہایت شان اور وقار کے ساتھ بسر کیا۔ وہ اپنی زندگی میں نیک نام تھے اور اپنے پچھلے نیک نامی کی شہرت چھوڑ گئے۔

ان کی یادگاروں میں ان کے نیک اور مہذب بیٹے محترم جمیل احسن کے علاوہ چند تصانیف بھی ہیں۔ ان کی ایک تالیف ''انساب قبایل افغانی'' ہے۔ اس کا الگ تعارف میں نے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ان کی ایک تالیف ''سالار مسعود غازی اور ان ایک غزوے'' کے بارے میں ہے، جو شاہ جہاں پور سے شمال میں پانچ چھ میل کے فاصلے پر ''پیرنالہ'' کے مقام پر پیش آیا تھا۔

فاضل مؤلف نے مذکورۂ بالا دونوں تصانیف کا ذکر خود اپنے قلم سے اپنی ''تاریخ مطیع'' میں صفحہ ۴۶-۱۴۵ اور صفحہ ۸۰-۸۷۹ پر کیا ہے اور چوں کہ انھوں نے قارئین تاریخ مطیع کو دونوں کتابوں کے موضوعات کے تفصیلی مطالعے کی دعوت دی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کتابیں شایع بھی ہوئی تھیں۔ مرحوم کی ایک دینی تالیف جو ''قرآنی احکامات'' کا ذکر ان کے حفیظ سعید اور یادگار سلف جمیل احسن شاہ جہاں پوری نے تاریخ مطیع پر اپنے پیش لفظ میں کیا ہے۔ انھی نے یہ کتاب چھپوائی تھی۔ ان تینوں کتابوں کے تذکار کے مطالعے سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان مطبوعات کی ضخامت کیا ہے اور کب اور کہاں سے ان کی طباعت و اشاعت عمل میں آئی تھی۔

ان کی معرکہ آرا تالیف ''تاریخ شاہ جہاں پور موسومہ تاریخ مطیع ہے۔ یہ تاریخ لکھ کر انھوں نے اپنے وطن دوست، صاحب علم و ذوق اور ایک قابل مؤرخ ہونے کا نہ صرف ثبوت دیا ہے بلکہ ایک اہم فرض ادا کیا ہے۔ انھوں نے اہل شاہ جہاں پور کا سر بلند کر دیا ہے۔ انھوں نے موجودہ زمانے کے تاریخ نویسی کے تصور کے مطابق ایک بلند پایہ اور جامع تاریخ شاہ جہاں پور لکھ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ اپنی ملازمت کے زمانے میں انھوں نے قوم و وطن کی جو خدمات انجام دیں وہ اپنی جگہ لیکن ٹھیک ٹھیک اسی دوران (۱۸۹۳ء تا ۱۹۲۰ء میں) انھوں نے اپنے مطالعہ و علم اپنے مشاہدے اور تجربات سے جو فایدہ اٹھایا اور تاریخ لکھ دی وہ ایک زندہ جاوید یادگار ہے، جس نے ان کے نام اور ان کے وطن مالوف کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔

اگرچہ اس کی اشاعت پر ایک سال سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اہل علم و نظر اور اصحاب ذوق کے حلقوں میں اس کی شہرت ابھی تک عام نہیں ہو سکی۔ اس بات کو میں اس طرح محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک کسی صاحب قلم نے اس پر نقد و تبصرہ کا قلم نہیں اٹھایا۔ البتہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ جب مولوی محمد صبیح الدین شاہ جہاں پوری نے اپنی تاریخ کی تکمیل کے لیے اس سے استفادہ کیا تھا تو تاریخ صبیح میں اس کی

خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے۔

وہ اپنی تاریخ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''مؤلف تاریخ مطیع نے انتہائی کوشش اور جاں کاہی سے مؤلف کتاب کی ذمے داری کو مدّ نظر رکھتے ہوئے پوری تحقیقات اور صحت سے واقعات اور حالات کو جمع کیا۔'' ۲۵

اس کے بعد وہ اس کی کسی خوبی کے بیان سے گریز کر کے اس کی خامیوں کے بیان پر توجہ کرتے اور ہمت صرف فرماتے ہیں لکھتے ہیں:

''مگر روزانہ کانٹ چھانٹ کے وہم سے وہ اس کو مکمل نہ کر سکے اور انھوں نے اپنی کتاب میں ان واقعات اور ان مشاہیر کے حالات کو بھی سمیٹ لیا، جو اتفاقیہ طور پر شاہ جہاں پور میں آئے تھے اور جن کا شاہ جہاں پور سے کوئی خاص تعلق یا واسطہ نہ تھا اس سے کتاب کی ضخامت تو بہت زیادہ ہوگئی مگر مقامی بزرگوں کے بہت نام چھوٹ گئے۔ اس کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ڈپٹی صاحب کا بیشتر حصہ عمر سرکاری ملازمت کی وجہ سے باہر گزرا تھا۔ اور دوران ملازمت ہی آپ نے اس کو ترتیب دیا تھا اس وجہ سے وہ یہاں کے مشائخین و اہل فن حضرات کے حالات جمع کرنے سے قاصر رہے۔

جس طرح انھوں نے کتابی معلومات حاصل کرنے میں کوشش و محنت کی ویسی ہی مقامی حالات کی فراہمی میں ایک حد تک سہل انگاری سے کام لیا۔

اور نیز اپنے زمانے کے حکما و شعرا و اہل فن حضرات کو قطعاً قلم زد کر دیا، جس کی وجہ خاص سمجھنے سے قاصر ہوں کہ گو ان کی تاریخ میں معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔

مگر اس کو بجائے شاہ جہاں پور کی تاریخ کے تاریخ روہیل کھنڈ، اودھ یا تاریخ مشاہیر ہند کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مگر پھر بھی معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب بہت مفید و کارآمد تھی کاش وہ طبع ہو جاتی اور

یہ کس درجہ افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو اور تمام عمر کی محنت اور ایک بہترین یادگار ان کے ورثا کی عدم توجہی سے بلا طبع کے رہ گئی۔ شعر

حسرت پہ اُس مسافر بے کس کے رویے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے''

یہ تاریخ صبیح کے پیش لفظ کے صفحہ ایک و دو کی مسلسل عبارت ہے۔ اسے مکمل جملوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ جواب کے نکات واضح رہیں اور تفہیم میں سہولت ہو۔

اوپر کے اقتباس میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ مرحوم مطیع اللہ خان کی تین جلدوں پر مشتمل تصنیف کی یہ پہلی جلد ہے جو ۹۸۸ صفحات پر محیط ہے، اس میں ''کانٹ چھانٹ'' کا کوئی عمل ہی نہیں ہوا۔ اس کی صورت یہ ہے:

الف: مسودے کی ریڈنگ کے دوران بعض چھوٹے ہوئے الفاظ بڑھائے گئے ہیں۔

ب: بعض جگہوں پر جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے اور صاف محسوس ہوتا کہ اس مقام پہ جملہ ہی چھوٹ گیا ہو۔

یا عبارت کی وضاحت کے لیے اس جملے کے اضافے کی ضرورت ناگزیر تھی۔

ج: ایک آدھ لفظ کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔

یہ تینوں صورتیں ایسی ہیں جن پر کانٹ چھانٹ کے عمل کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ فاضل مصنف کو اپنے علمی اور تاریخی مضمون پر اور تحریر کی زبان (اُردو) اور اسلوب نگارش پر اتنا عبور ہے کہ اس کے قلم سے جو جملہ نکلتا ہے وہ ایسا مکمل اور اتنا جامع ہوتا ہے کہ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، پھر جو بھی عمل ہوا ہے اتنا کم ہوا ہے کہ بڑے سائز کے ۹۸۸ صفحے کی کتاب میں اسے کم سے کم پیمانے پر بھی وقوع کے بجائے عدم وقوع پر محمول کیا جائے گا، پھر یہ بھی واضح رہے کہ کتاب کا یہ پہلا مسودہ ہے۔ اسی صورت سے اس کے چربے اٹھا کر چھاپ دیا گیا ہے۔

مولوی صبیح الدین مرحوم نے ''کانٹ چھانٹ'' کے عمل اور اس کی حد تکمیل کو ان کے وہم کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حال آں کہ اگر کسی کو وہم میں مبتلا قرار دیا جائے یا کسی کو مراق سے منسوب کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے اسے اپنے اوپر اعتماد نہیں، وہ شخص پختہ فکر، مستقل مزاج اور صائب الرائے نہیں بلکہ ناقابلِ اعتماد اور فاتر العقل ہے! میرا خیال یہ ہے کہ یہ میاں صاحب کی سخت زیادتی ہے۔ خاں صاحب ہرگز کسی وہم میں مبتلا تھے نہ انھیں کوئی مراق تھا۔ نہ وہ بے اعتمادی کے شکار تھے۔ ان کے سامنے تاریخ کا ایک خاکہ تھا اسے انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اسی کے مطابق انھوں نے اسے مکمل کیا تھا اور تکمیل کے بعد بھی وہ اس میں رنگ بھرتے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں بہ قایمیِ ہوش و حواس مصروف رہے تھے۔ معین الدین نامی مترجم اورنگ زیب و نپولین سے اپنی کتاب پر مقدمہ لکھوانا بھی درحقیقت پیشگی شہادت کے انتظام اور تحریکِ ردّ استغاثہ کے سروسامان سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۔ ہر تالیف میں مذکورات و مندرجات کے دو درجے ہوتے ہیں، ایک لازمی دوسرے ضمنی! کسی داستان کی تکمیل ان دونوں قسم کے کیریکٹروں کے بغیر نہیں ہوتی۔ یہ مصنف کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ ثانوی کیریکٹر یا ضمنی واقعے کو متن میں شامل کرے، حاشیے میں اسے جگہ دے یا ضمیمہ و استدراک کے ذریعے تصنیف میں حسن پیدا کرے اور تکمیل کا کارنامہ انجام دے۔ مصنف کے اس اختیار کو اُس سے چھینا نہیں جا سکتا۔ البتہ اس کے طریق استعمال پر حسن و قبح کی بحث کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کا تذکرہ ہی نہیں کیا گیا ہے جس کا شاہ جہاں پور سے کوئی خاص تعلق اور واسطہ نہ رہا ہو! پھر اگر کسی درجے میں یہ بات اصول تصنیف کے خلاف بھی ہو تو اس کا حق صاحب تاریخِ صبیح کی حد تک تو صاحبِ ''تاریخ مطیع'' کی بھی حاصل ہونا چاہیے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولوی صبیح الدین صاحب نے اپنی ۳۵۸ صفحے کی تاریخ میں ۳۳ صفحات کا ضمیمہ غیر متعلق شخصیات کے بارے میں شامل کیا ہے۔ اگر وہ اسے شامل نہ کرتے تو ان کی کتاب کے حسن کو ہرگز بٹّا نہ لگ جاتا! مولوی مطیع اللہ خاں کو ۹۸۸ صفحات کی تاریخ میں اسی سائز میں سو صفحے کا ضمیمہ شامل کرنے کا حق تھا۔ بلاشبہ انھوں نے اپنی تاریخ کے آخر میں مُلّا عبدالقادر بدایونی کا مفصل تذکرہ لکھا ہے لیکن شاہ جہاں پور، کانٹ اور اس علاقے سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے، اسے بے فایدہ اور لاحاصل ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

۳۔ یہ کہنا کہ غیر متعلق حضرات کے تذکرے نے جگہ گھیر لی۔ اس کی وجہ سے ''مقامی بزرگوں کے بہت نام چھوٹ گئے۔'' درحقیقت اس اعتراض سے پہلے انھیں چند بزرگوں کے نام گنا کر یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ وہ بزرگ اس شان کے تھے کہ ان کے تذکرے سے تاریخ شاہ جہاں پور کی عزت کو چار چاند لگ جاتے۔

آخر صبیح الدین میاں نے مشایخ، شعرا، اطبا وغیرہ میں ایسے حضرات کو شامل کر کے جن کے نام تاریخ صبیح کے سوا کہیں اور

ڈھونڈے نہ ملیں گے۔شامل کر کے شاہ جہاں پور کی عظمت کو کون سے چار چاند لگا دیے ہیں؟

یہ کہنا چاہیے کہ شخصیات کے انتخاب میں ان کا معیار بہت بلند تھا اور ان کی کسوٹی پر جو پورا نہیں اترا، اسے اپنی تاریخ میں شامل نہیں کیا۔

۴۔ مولوی صبیح الدین صاحب نے یہ کیا فرمایا کہ انھوں نے اپنے زمانے کے حکما اور شعرا کو بالکل قطعاً قلم زد فرما دیا۔ یہ آں مرحوم پر مولوی صبیح الدین میاں آنریری مجسٹریٹ درجہ اول پر محض بہتان ہے۔ان کی تاریخ کا پورا تیسرا حصہ شاہ جہاں پور کے اعیاں، ارباب کمال اور خوانین و مشاہیر کے تذکار میں تھا، جس کا انھوں نے صرف لکھنے کا عزم ہی نہیں کیا تھا، بلکہ اسے مکمل کر کے اپنی یادگار چھوڑ گئے تھے، جو ان کے اخلاف کے پاس ان کے عظیم الشان تاریخی ورثے کے طور پر محفوظ ہے۔ بالفرض اگر کسی درجے میں اس میں کوئی صداقت بھی ہو کہ انھوں نے اپنے زمانے کے بعض حکما و شعرا کو چھوڑ دیا ہے تو اس کی مناسب توجیہ یہ ہوگی کہ اپنے معاصرین کے کمالات و فضایل کے ادراک میں اکثر معاصر تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور قدما کے فضل و کمال کے اعتراف میں فراخ دلی کے اظہار سے قاصر رہے۔

۵۔ اور یہ بات جو انھوں نے کہی کہ ''اس کو بجاے شاہ جہاں پور کی تاریخ کے تاریخ روہیل کھنڈ، اودھ یا تاریخ مشاہیر ہند کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔'' یہ بات انھوں نے درحقیقت مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ کی تیسری جلد کے ردّ میں کہی ہے۔ درحقیقت شاہ جہاں پور کا تعلق روہیل کھنڈ، اودھ دونوں سے کچھ ایسا رہا ہے کہ اودھ اور روہیل کھنڈ کو نظر انداز کر کے شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی! شاہ جہاں پور کی خصوصیات خواہ کتنی ہی نادر ہوں وہ روہیل کھنڈ اور اودھ سے الگ نہیں ہیں۔

۶۔ اس کے باوجود کہ میاں صاحب کو تاریخ مطیع ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔اس کے حسن و خوبی کے اعتراف پر وہ مجبور ہوئے۔انھیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ

''ان کی تاریخ معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔''

اس سے آگے وہ پھر لکھتے ہیں:

''پھر..... معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب بہت مفید و کارآمد تھی۔کاش وہ طبع ہو جاتی!''

۷۔ اس کی عدم اشاعت پر حسرت کا اظہار کر کے وہ ایک دو دھارا خنجر صاحبِ ''تاریخ مطیع'' کے اخلاف کے سینے میں بھی بھونک دیتے ہیں۔جب وہ کہتے ہیں:

''اور یہ کس درجے افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو اور تمام عمر کی محنت اور ایک بہترین یادگار ان کے ورثا کی عدم توجہی سے بلاطبع کے رہ گئی۔''

میں تو میاں صاحب کے اس نقد و تبصرے کے بعد ان کے ذوق و مسرت کا اندازہ کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس تاریخ کا نہ چھپنا اور مورخ مرحوم کے اخلاف کا اس کی اشاعت کی فکر سے غافل رہنا ہی میاں صاحب کی خوشی کا موجب تھا۔میرے خیال میں فاضل مؤرخ کو نامراد قرار دینا اور ان کے اخلاف کی مجبوریوں اور حالات کی عدم مساعدت کا ان کی عدم توجہی کو عنوان قرار دینا میاں صاحب کے احساس افسوس ناکی سے کہیں زیادہ شرم ناک ہے۔

آخر میں اس تبصرے کو انھوں نے اس شعر پر ختم کیا ہے:

حسرت پہ اُس مسافر بے کس کے روئیے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے!

ہمیں بھی اس جہالت اور بد ذوقی پر افسوس اور نہایت شرم ناک افسوس ہے کہ میاں صاحب کو نہ شاعر کا نام معلوم ہے نہ شاعری کے فن سے آشنا ہیں نہ وزن وغیرہ کی انھیں خبر ہے اور نہ انھوں نے یہ شعر اس کے صحیح محل میں استعمال کیا ہے۔ انھیں مطیع اللہ خاں کے ورثا کی عدم توجہی سے شکوہ ہے اور شعر میں مسافر کی مقصد میں ناکامی حسرت زدگی اور بدنصیبی کا افسوس ہے! کاش! انھوں نے اس شعر کا استعمال ہی نہ کیا ہوتا۔ یہ شعر مصحفی امروہوی کا ہے۔

البتہ تاریخِ صبیح کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر دایرہ فن کی قریب العہد بلکہ مولوی صبیح الدین میاں کی ہم عصر شخصیات جو بیسویں صدی کی تیسری دھائی کے خاتمے تک نمایاں ہوئی تھیں اور ۱۹۲۲ء میں جب مولوی مطیع اللہ خاں نے اپنی تاریخ کا مقدمہ لکھ کر قلم رکھا تھا، اس وقت ان کی کوئی حیثیت نہ تھی، پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مطیع اللہ خاں کے انتخاب کا معیار بہت بلند تھا۔ ان کی کسوٹی پر یہ تمام شخصیات ہرگز پوری نہیں اتر سکتی تھیں۔ مولوی صبیح الدین صاحب کے پیمانۂ انتخاب کا اندازہ لگائیے کہ انھوں نے مولوی حافظ حکیم محمد صاحب کا تذکرہ لکھا ہے، جو ان کے استاد تھے اور انھیں کے اصرار پر مولوی صبیح الدین میاں نے تاریخ لکھنے کا عزم کیا تھا، ان کے تذکرے کے ساتھ ان کے والد گرامی مولوی کفایت اللہ کا ترجمہ بھی لکھا ہے۔ ان کی خوبی علمی فضایل یا درس و تدریس کے کمالات و شہرت نہیں ان کا بھولا ہونا اور سیدھے پن کی شہرت تھی اور ان کے دو بیٹوں مولوی عبداللہ اور منشی فضل احمد کے ذکر کا اصل سبب یہ تھا کہ دونوں ان کے استاد کے چھوٹے بھائی تھے یا مستقبل کی اس توقع پر لکھا تھا کہ دونوں کا انتقال عمرِ طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہو گیا اور صاحبِ تاریخِ صبیح کو توقع تھی کہ اگر یہ دونوں بھائی عمرِ طبعی کو پہنچتے تو اس صوبے میں بہ اعتبار علم و فضل نہایت ممتاز اور یگانۂ عصر ہوتے۔ اور اگرچہ ابھی ان کے علم و فضل کا ظہور نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی کارنامہ انجام پایا تھا لیکن صاحب تاریخ نے محسوس کر لیا تھا کہ ''یہ دونوں بھائی دنیا سے کیا گئے کہ علم ہی شاہ جہاں پور سے رخصت ہو گیا۔'' اس پر ستم یہ کہ اپنے استاد کے بھانجے منشی عبدالسلام کے تذکرۂ خیر سے بھی قلم کو روک نہیں سکے کہ انھوں نے میاں صاحب کی تاریخ صبیح کی نہایت کوشش اور ''ہمدردی'' سے کتابت کا کام انجام دیا تھا۔ میرے خیال میں یہ موقع ان کی توجہ اور قابلیت کے اظہار کا تھا۔ لیکن کوشش تو محض بے محل لفظ ہے اور ''ہمدردی'' کا جواز شاید اس طرح ثابت کیا جا سکے کہ انھوں نے کتابت کی اجرت میں کوئی خاص رعایت کر دی ہو یا شاید بالکل ہی نہ لی ہو! ان کی تعریف میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''ان کا ایک دواخانہ ''رفیق الملک'' ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹری شدہ شاہ جہاں پور میں ہے، جس میں دواؤں کا بہت اعلیٰ انتظام ہے۔'' اس اظہار نے ثابت کر دیا کہ وہ حکیم نہیں عطار دواخانہ رفیق الملک کے مالک تھے اور وہ بھی چلتا نہیں تھا۔ اس کی دو وجہیں ہیں؛

- ☆ ایک یہ کہ اس وقت کوئی حکیم اپنے مطب یا دواخانے کو رجسٹرڈ کرانے کا ننگ گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کا بھی ثبوت یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں و حکیم محمود خاں اور مومن خاں کے باپ چچا کے تراجم میں ان کے مطبوں کے رجسٹریشن کا نام آیا ہے۔
- ☆ اور نہ خود صاحب تاریخ صبیح نے اپنے استاد مولوی حکیم محمد کی طبابت کے رجسٹریشن کی خوبی کا ذکر کیا ہے، نہ دیگر اطبا کے تراجم میں کہیں رجسٹریشن کا نام آیا ہے۔
- ☆ اگر منشی عبدالسلام بھی طبیب ہوئے تو ان کی طبابت اور حذاقت کا ذکر آتا، نہ کہ دواؤں کے اعلا انتظام کا! طبقۂ علما

میں اس مقام پر ایک خاندان کے پانچ افراد کا ذکر آیا ہے۔ حال آں کہ ان میں سے ایک کے سوا کوئی عالم نہ تھا اور اس لیے اس صف میں شرکت کی عزت کا سزاوار بھی نہ تھا۔ حال آں کہ خدا انھیں ذوق سے نوازتا تو وہ اسی خاندان کے دو افراد منشی فضل اللہ جو میاں صاحب ہی کے بہ قول ''اعلا درجے کے خوش نویس تھے'' اور ان کے بھانجے منشی عبدالسلام جو خوش نویسی کے فن میں ان کے شاگرد تھے، دونوں کا ترجمہ فنونِ لطیفہ کے ضمن میں کر دیتے تو وہ خوش نویسوں کا بھی اضافہ ہو جاتا۔

میاں صاحب نے شکوہ کیا ہے بلکہ تاریخِ مطیع کے نقص کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صاحب تاریخِ مطیع ''اہل فن کے حالات جمع کرنے سے قاصر رہے۔'' اور یہ کہ انھوں نے ''اہل فن حضرات کو قطعاً قلم زد کر دیا، جس کی وجہ خاص سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' لیکن اگر چہ شاہ جہاں پور کی تاریخ میں میاں صاحب کے ذوق و تحقیق کے مطابق صرف ایک تعزیہ بنانے والا، ایک چابک سوار، ایک قوال، ایک نواب رام پور کے دربار میں مجری اور دو ''سرودی'' ہی لایق تذکرہ تھے تو صاحب تاریخِ مطیع نے ان کا یا ان میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہ کر کے اپنے ذوقِ لطیف کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ اس قسم کے رطب و یابس اور فضولیات سے پاک ہے اور یہ اس کی بہت بڑی خوبی ہے۔

چند ضمنی مآخذ

ابھی آپ نے جن کتابوں پر تبصرہ ملاحظہ فرمایا۔ ان کا شاہ جہاں پور سے راست تعلق تھا۔ خواہ ان کی تصنیفی و موضوعی نوعیت کچھ ہو اور ان کا افادی پہلو بھی کسی درجے کا ہو۔ اس پہلو پر بھی ہم نے توجہ نہیں کی کہ ان کا پایہ استناد کیا ہے۔ یہ بحث ہمارے موضوع ہی سے باہر تھی۔ ان تالیفات کے علاوہ کچھ مولفات و مرتبات اور بھی ہیں جن کا راست تعلق اگر چہ شاہ جہاں پور سے نہیں، لیکن اگر تاریخی و سیاسی نقطۂ نظر سے کسی صاحب ذوق کا موضوع ہو تو وہ ذیل کے مجلدات اور مرتبات و مولفات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

فریڈم اسٹرگل اِن اتر پردیش:

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلق جو لٹریچر ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر تک مرتب اور غیر مرتب کسی شکل میں بھی منتشر تھا، یو پی گورنمنٹ کے زیر اہتمام مرتب کر کے شایع کر دیا گیا ہے۔ یہ لٹریچر چھ ضخیم جلدوں میں ۴۸۳۴ صفحات پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ پچاسوں صفحات پر مشتمل اشخاص، تاریخی عمارات و مقامات کی تصویریں، دستاویزات کے عکس، اضلاع کے نقشے، مہریں، مختلف قسم کے گوشوارے وغیرہ مجلدات کے مجموعی صفحات پر مستزاد ہیں۔ ہر جلد کے آخر میں اشخاص، مقامات، شہر و قصبات، اخباروں، کتابوں، تحریکوں وغیرہ کا انڈکس شامل کیا ہے اور چوں کہ چھٹی جلد بھی پانچ جلدوں کے مجموعی انڈکس پر مشتمل ہے، اس لیے کوئی چیز ہو اور اس کا صوبہ یو پی کے کسی ضلع سے تعلق ہو، ایک منٹ سے پہلے نظروں کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ اور ان مجلدات کے مضامین کی غیر سائنٹیفک تدوین نہ ہونے کی وجہ سے جو الجھن ایک مصنف محسوس کرتا ہے وہ یک دم دور ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے صوبہ متحدہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلق سیاسی و تاریخی مواد کا اتنا بڑا اور اہم ذخیرہ کوئی دوسرا نہیں۔ تاریخِ سیاسیاتِ ہند پاکستان کی عظیم الشان خدمت ہے جو آزاد ہندوستان میں صوبہ یو پی کی حکومت نے انجام دی ہے۔ تاریخ کا یہ بیش بہا سرمایہ جو

ہمارے سامنے غیر مرتب صورت میں چھ جلدوں میں محفوظ جمع ہو گیا ہے۔اس نے یہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ اب اس پر علاقہ وار تحقیق و تدوین کے امور انجام دے جائیں۔تاریخ کے پچاسوں موضوعات ایسے سامنے آتے ہیں، جن کا تعلق براعظم ہند پاکستان کے کسی ایک صوبہ و ریاست سے نہیں بلکہ پورے براعظم کے مفاد سے ہے، ان پر توجہ کی جائے۔

تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء:

روہیل کھنڈ یا اس کے کسی ضلع کی کوئی تاریخ ایسی نہیں، جس میں ''شاہ جہاں پور'' نے اپنا مقام نہ پایا ہو! اس سلسلے میں ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت کے حوالے سے چند تالیفات ایسی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔سید خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب ''جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء'' ایک اہم تالیف ہے، جو جنگِ آزادی کی سو سالہ یادگار منانے کے موقع پر ۱۹۵۷ء میں شایع ہوئی تھی۔اسی موقع پر ''فریڈم اسٹرگل اِن اتر پردیش'' کی اشاعت کا آغاز ہوا تھا، لیکن رضوی صاحب اپنی تالیف میں اس سے استفادہ نہیں کر سکے تھے۔اس لیے فریڈم اسٹرگل اِن اتر پردیش کی تیسری، پانچویں جلدوں میں خاص طور پر شاہ جہاں پور میں تحریک کی سرگرمیوں کا ذکر آیا تھا اور وہ جلدیں ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۱ء میں شایع ہوئی تھیں، البتہ انھوں نے اپنی تالیف کے دوسرے ایڈیشن میں ان سے خوب فایدہ اٹھایا اور اس میں شاہ جہاں پور نے بھی اپنا حصہ پایا۔میرے سامنے اس کی لاہور اشاعت ہے، جو ۲۰۰۷ء میں جنگ آزادی کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقع پر شایع ہوئی۔زیرِ نظر اشاعت کی اطلاع کے مطابق جو ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں نظر ثانی و اضافہ شدہ رام پور سے شایع ہوا تھا، یہ اس کی نقل ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات):

یہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تالیف ہے جو ۱۹۷۶ء میں کراچی سے شایع ہوئی تھی۔فاضل مؤلف کا تعلق چوں کہ آنولہ ضلع بریلی سے تھا۔اس لیے ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے بریلی اور روہیل کھنڈ کے دیگر اضلاع میں انقلابی سرگرمیوں کے تذکرے نے اس تالیف میں زیادہ جگہ پائی اس میں شاہ جہاں پور بھی ہے اور وہاں پیش آنے والے واقعات اور مجاہدین اور ان کی خدمات کا ذکر آیا ہے۔ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ان کے مقام کے اعتراف سے گریز نہیں کیا۔

قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان:

اس کتاب کی فاضل مؤلفہ ڈاکٹر عابدہ سمیع (علی گڑھ) ہیں۔ان کے سامنے چوں کہ اسی موضوع پر رضوی و قادری صاحبان کی ہر دو تالیفات کے علاوہ فریڈم اسٹرگل کا نہایت قیمتی ذخیرہ بھی تھا، جس سے انھوں نے اپنی تالیف میں استفادہ کیا تھا، اس لیے ان کی تالیف میں ترتیبِ مضامین و تالیف مباحث کا زیادہ سلیقہ اور حسن پیش کش پایا جاتا ہے۔یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں دہلی میں شایع ہوئی تھی۔

شاہ جہاں پور کے تذکرے سے اس کے صفحات مزین ہیں۔

حواشی

۱۔ ''تاریخِ مطیع'' (جلداول) صفحہ۲۳،۲۴
۲۔ ایضاً: صفحہ۳۴۴ بہ حوالہ ''اخبارِ محبت''۔ ''انہارالبحر'' و ''بہادرنامہ''
۳۔ ایضاً: صفحہ۸۳-۳۸۲
۴۔ ایضاً: صفحہ۳۸۲
۵۔ ''تاریخِ مطیع'': جلداول، صفحہ۳۶
۶۔ ایضاً: صفحہ۴۱۷
۷۔ ''تاریخِ صبیح'': حصہ اول، صفحہ۲۸-۱۲۷
۸۔ ''تاریخِ شاہ آباد موسوم بہ نامۂ مظفری'' (حصہ اول) لکھنؤ مطبع مجتبائی، ۱۹۱۷ء، صفحہ۴۸۸
۹۔ ''تاریخِ مطیع'': صفحہ۳۷
۱۰۔ ''تاریخِ مطیع'': صفحہ۲
۱۱۔ ''تاریخِ مطیع'': جلداول، صفحہ۱۴۵
۱۲۔ ''تاریخِ صبیح'': جلداول، صفحہ۲۹-۱۲۸
۱۳۔ ''تاریخِ مطیع'': صفحہ۳۷
۱۴۔ ''تاریخِ مطیع'': صفحہ۴۲۱
۱۵۔ ''تاریخِ صبیح'': جلداول، صفحہ۱۲۹
۱۶۔ ''تاریخِ مطیع'': صفحہ۳۷
۱۷۔ ''تاریخِ مطیع'': صفحہ ۳۷
۱۸۔ ''تاریخِ مطیع'': صفحہ۳۷
۱۹۔ ''تاریخِ صبیح'': جلداول، صفحہ۲
۲۰۔ ''تاریخِ صبیح'': صفحہ۱۲۲
۲۱۔ ''تاریخِ صبیح'': صفحہ۲۲۳
۲۲۔ ''تاریخِ صبیح'': صفحہ۳
۲۳۔ ایضاً ۲۳
۲۴۔ ''تاریخِ صبیح'': حصہ دوم، صفحہ۸۸-۱۸۷
۲۵۔ ''تاریخِ صبیح'': صفحہ:۲

Abstract

Shahjahanpur is an important district and city of United Provinces, India, having a fertile soil that has produced a lot of great personalities. In this article the author has made an attempt to explore the varied dimensions of the history of Shahjahanpur by going through nineteen books, published and unpublished, on the topic. These books have been discussed and reviewed in order to reveal the multiple aspects of the history of Shahjahanpur. Some of the manuscripts, discussed here are not available anymore and thus this article provides a good source of information for the researchers who want to study any related topics .

The books and manuscripts mentioned in the article include Bahadur Nama, Bahadur Khani, Dalair Nama, Akhbar-e-Mahabbat, Ansab-e-Qabail-e-Afghani, Tazkiratul Ahbab, Anharul Bahr, Gazetteer of Shahjahanpur, Tareekh-e-Shahjahanpur, Tareekh-Ahsani and Shu'rai-e-Ajam-o-Hind.

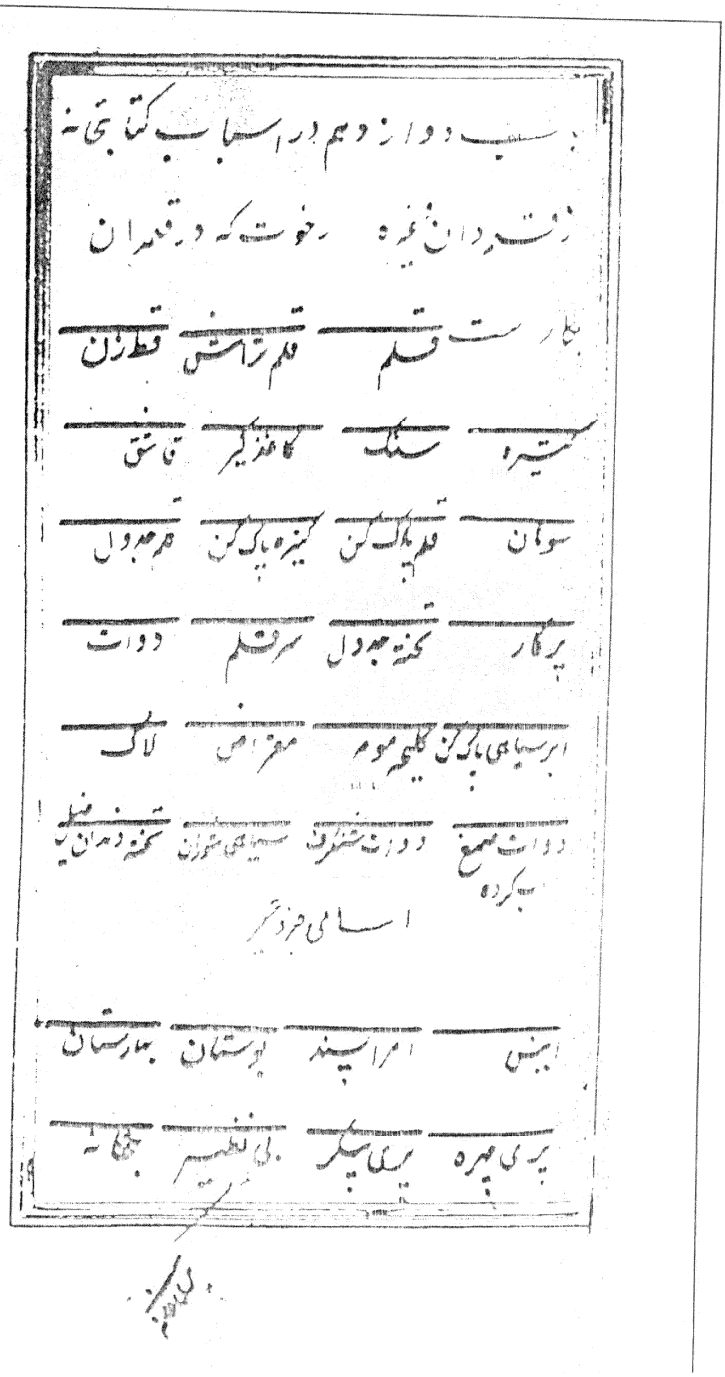

سبب دوازدهم در اسباب کتابخانه

زفت دان، خیره، رخوت که در قلمدان

بکار است: قلم، قلم تراش، قط زن

کستره، سنگ، کاغذگیر، قاشق

سوهان، قلم پاک کن، گزیره پاک کن، قلم جدول

پرگار، تخته جدول، سر قلم، دوات

ابر سیاهی پاک کن، کلیچه موم، مقراض، لاک

دوات صمغ عربی کرده، دوات مشقوف، سیاهی مشقوف، تخته دندان فیل

اسامی جزو دیگر

ابیض، امراسپند، بوستان، بهارستان

پری چهره، پری پیکر، بی نظیر، بتخانه